طلوعِ اسلام

ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
کراچی

ٹیلی فون نمبر
۴۱۴۸۸

جلد ۹
نمبر ۸
ستمبر ۱۹۵۶ء

فہرست مضامین

لمعات	۲—۶
طلوع اسلام کنونشن	۷
الفتنۃ الکبریٰ	۸
علماء کون ہیں؟ (سلیم کے نام خط از محترم پرویز صاحب)	۹—۲۴
مجلس اقبال	۲۵—۳۲
قرآنی معاشرہ (از محترم عمر احمد صاحب عثمانی)	۳۳—۴۵
نقد و نظر	۴۶—۴۸
پلاننگ بورڈ کی مجوزہ زرعی اصلاحات	۴۹—۵۹
حقائق و عبر	۶۰—۶۸
اشتہارات	۶۹—۸۰

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
بارہ آنے

بدل اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے
سالانہ آٹھ روپے
غیر ممالک سے
۱۴ شلنگ

ہمارا
مستقل پتہ:-
۱۵۹/۳۔ ایل، پی، ای، سی، ایچ
سوسائٹی، کراچی ۲۹

ضروری اعلان:- آئندہ پوسٹ بکس کے پتہ پر ہرگز خط و کتابت نہ کیجئے۔ ورنہ آپ کے خطوط ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

لمعات

مژدهٔ صبح دریں تیره شبانم دادند

پاکستان کے حالات جس حد تک بگڑ چکے ہیں، اور جس تیزی سے اور بگڑتے جا رہے ہیں، اس کے متعلق کسی شرح و بسط سے لکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کونسی آنکھ ہے جو ہر روز اس عبرت انگیز منظر کا تماشا نہیں کرتی اور وہ کون دل ہے جو ہر آن اس الم انگیز حقیقت کا احساس نہیں کرتا۔ حالات کی یہ خرابی نہ کسی خاص خطہ تک محدود ہے، نہ کسی خاص طبقہ سے مخصوص۔ یہ اس حد تک عالمگیر ہو چکی ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا تھا کہ کَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِیْرًا (۷۶)۔ جس کی تباہیاں متعدی امراض کے جراثیم کے مانند اس طرح فضا میں پھیلی ہوئی ہوں کہ آپ لاکھ بچنے کی کوشش کریں وہ آپ تک اڑ کر پہنچ جائیں۔ ان کی شدت، وسعت اور گہرائی کا اس سے اندازہ لگائیے کہ (عوام تو ایک طرف) وہ ارباب حل و عقد جو امور مملکت کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہیں، بالکل بوکھلائے ہوئے پھر رہے ہیں۔ اور کسی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ابتری کا علاج کیا ہے۔ ان کی یہی پریشانی فکر و نظر اور سراسیمگیٔ قلب و نگاہ ہے جس کی وجہ سے حالت یہ ہو چکی ہے وہ اس گتھی کو جس قدر سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ اتنی ہی الجھی چلی جاتی ہے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ سارا ملک ایک عالمگیر مایوسی کے لپیٹ میں آ چکا ہے۔ اور کسی کی نظروں کے سامنے امید کی کوئی کرن دکھائی نہیں دیتی۔ ہر شخص اپنے آپ کو یوں بے بس محسوس کر رہا ہے۔ گویا وہ ایک تناور درخت کے ساتھ مضبوط زنجیروں سے بندھا ہوا ہے۔ اور سامنے آتش فشاں پہاڑ سے جہاں کہ لاوے کا سیلاب اس کی طرف امنڈے چلا آ رہا ہے۔ وَیَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ

سوال یہ ہے کہ کیا ان حالات کے سدھرنے کی کوئی شکل ہو سکتی ہے؟ کیا ان خرابیوں کا کوئی علاج ہے؟ کیا ہم اس بے پناہ عذاب سے نجات پا سکتے ہیں؟ کیا ہماری بازآفرینی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے؟ بظاہر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ان خرابیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتا ہے اور اس سے عوام میں اور زیادہ بددلی اور بداعتمادی پھیلاتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو نہ پہلے پاکستان کی تشکیل کے حق میں تھا، اور نہ اب اس کے دل میں اس کے استحکام و بقا کے لئے

عیر سگالی کے جذبات ہیں۔ لیکن یہاں وہ طبقہ بھی تو موجود ہے جو پہلے بھی صدقِ دل سے پاکستان کے حصول میں کوشاں تھا۔ اور اب بھی پوری دیانت سے اس کے قیام وبقا کا خواہشمند ہے۔ ہم دیکھتے یہ ہیں کہ ان خرابیوں کا کوئی موثر علاج ان کی سمجھ میں بھی نہیں آتا بالفاظ دیگر۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اس مسئلہ کا حل ہماری عقل وفکر کی حد سے آگے ہے۔ اس تک ہمارے محدود ذہنوں کی رسائی نہیں ہوسکتی۔

دنیا میں جو قومیں انسانی معاملات کو سلجھانے کے لئے انسانی عقل وفکر ہی کو آخری ذریعہ سمجھتی ہیں۔ ان کے لئے یہ صورت حالات جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ فی الواقعہ نا امیدی اور بے بسی کی آخری حد ہے۔ ان کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ وہ یہ کہہ کر مایوس ہو جائیں کہ ان مشکلات پر قابو پالینا ہماری دسترس سے باہر ہے۔ لیکن انسانوں کا ایک اور گروہ ہے جو ایسے حالات میں بھی مایوس نہیں ہوسکتا۔ ان کے متعلق مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ کوئی جانور کتنا ہی بھوکا کیوں نہ ہو، اگر گھاس کسی ایسی جگہ رکھی ہے جو اس کی رسی کی لمبائی سے آگے ہے تو اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں کہ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں اس گھاس کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتا رہے اور بھوک سے مرجائے۔ لیکن یہی صورت کسی انسان کے ساتھ پیش آجائے تو وہ ایسے موقع پر مایوس ہوکر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ کسی ایسے ذریعے کی تلاش کرتا ہے جس سے مطلوب تک پہنچ جائے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ جب کسی بچے کا ہاتھ بسکٹوں کے ڈبے تک نہیں پہنچتا تو وہ کسی تپائی یا کرسی پر کھڑا ہوکر اپنا ہاتھ اس تک لے جاتا ہے۔ انسان اور حیوان میں بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ انسان اوزار (INSTRUMENTS) بنانا جانتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو چیز اس کے "حیوانی ہاتھ" کی دسترس سے باہر ہو یہ اس تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ جو کام انسانی ہاتھ کے لئے اوزار کرتا ہے (یعنی اس کی دسترس کی حدود کو وسیع کر دیتا ہے) وہی کام انسانی عقل کے لئے وحی کرتی ہے یعنی جو مقام تنہا عقل انسانی کی حد سے اوراء ہو۔ اگر وہی عقل وحی کی راہ نمائی کے تابع چلے تو وہ مقام اس کی دسترس کے اندر آجاتا ہے۔ بالفاظ دیگر جس طرح عام حیوانوں سے وہ انسان آگے ہوتا ہے جو اوزار بنانا جانتا ہے۔ اسی طرح عام انسانوں سے وہ انسان آگے ہوتا ہے جو اپنی عقل سے وحی کی روشنی میں کام لیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مقام جہاں پہنچکر ایک ایسا انسان قطعاً مایوس ہوکر بیٹھ جاتا ہے جو انسانی مشکلات کے حل کے لئے عقل انسانی ہی کو واحد اور آخری ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ مقام اس انسان کے لئے قطعاً مایوسی کا مقام نہیں ہوتا۔ جو اپنی عقل سے وحی کی راہ نمائی میں کام لیتا ہے۔ وحی کی روشنی اس کی عقل کی حدود کو وسیع کر دیتی ہے

جن حالات سے ہم دوچار ہیں۔ ان میں (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) ایک ایسی قوم کے لئے فی الواقعہ امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہ سکتی جو انسانی مشکلات کے حل کے لئے عقل انسانی ہی کو چارہ ساز سمجھے۔ لیکن ہمارا شمار تو ان قوموں میں نہیں ہونا چاہیئے ہم تو وحی پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے مدعی بھی ہیں (اور بجا طور پر مدعی) کہ خدا کی آخری وحی اپنی اصلی حالت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن یہ حقیقت کس قدر تاسف انگیز اور عبرتناک ہے کہ اس ایمان اور دعوے کے باوجود عملاً ہماری حالت وہی ہے جو ان اقوام کی ہونی چاہیئے جو وحی کی راہ نمائی پر ایمان نہیں رکھتیں۔ اور تنہا فکر انسانی ہی کو خضر راہ سمجھتی ہیں۔

آپ غور کیجئے کہ حالات کو سدھارنے اور مشکلات پر قابو پانے کے لئے جس قدر تجاویز مختلف گوشوں سے سامنے لائی جاتی ہیں، ان میں وحیٔ خداوندی کی طرف کہیں دور کا بھی اشارہ ہوتا ہے؟ کہیں نہیں ہوتا۔ کبھی نہیں ہوتا۔ ہم ان مشکلات کا حل اسی نہج پر تلاش کرتے ہیں جس پر وہ قومیں حل ڈھونڈھتی ہیں، جو وحی پر ایمان نہیں رکھتیں۔ یا جن کے پاس وحیٔ الٰہی منزہ شکل میں موجود نہیں۔ اس سے دو ہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ یا تو یہ کہ ہم وحیٔ خداوندی پر دل کی گہرائی سے ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ہمارا اقرار محض رسمی اور زبانی ہے۔ اور یا یہ کہ ہم وحیٔ الٰہی کو آزما کر اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ اس کی راہ نمائی بھی کشود کار کی کوئی صورت پیدا نہیں کر سکتی۔ انسانی معاملات کا حل انسانی عقل ہی کی رو سے ممکن ہے۔ اور جو مقام انسانی عقل کی حد سے آگے ہو۔ وہاں تک وحی کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔ جہاں تک قوم کی حالت کا ہم مطالعہ کر سکتے ہیں یہ نظر آتا ہے کہ قوم میں اس وقت تین نمایاں طبقے ہیں۔ ایک طبقہ تو وہ ہے جو خدا رسول۔ وحی وغیرہ کے الفاظ محض رسماً دہرا دیتا ہے۔ انھیں قطعاً معلوم نہیں کہ ان الفاظ کا مفہوم کیا ہے اور انسان کی عملی زندگی سے ان کا واسطہ کیا؟ یہ عوام کا طبقہ ہے۔ دوسرا طبقہ مذہب پرست حضرات کا ہے جن کا ایمان ہے کہ وحی (یا مذہب) کا تعلق انسان کی آخرت سے ہے۔ اس دنیا کے معاملات سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو (مذہب پرست طبقہ کی ذہنی اور عملی حالت سے اندازہ لگا کر) اس نتیجہ تک پہنچ چکا ہے کہ مذہب اور اس کے متعلقات، انسان کے دورِ جہالت کی یادگار ہیں۔ عقل وعلم کی (موجودہ) دنیا میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ اس وقت ہمیں کوئی ایسا طبقہ نظر نہیں آتا (افراد تو یقیناً ہیں۔ لیکن کوئی نمایاں طبقہ ایسا نہیں) جو اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھتا ہو کہ وحی کی راہ نمائی ان مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتی ہے جن کی گرہ کشائی تنہا عقل کے بس کی بات نہیں۔

اس صورتِ حالات کا نتیجہ جو اوپر بیان کی گئی ہے۔ بڑا تباہ کن ہوتا ہے۔ اس سے یہی نہیں ہوتا کہ ایسی قوم وحی کی برکات سے محروم رہ جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ قوم انسانی عقل سے بھی کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس کے سینے کی کشمکش، ذہنی تذبذب اور قلب و زبان میں عدم موافقت۔ ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ جس میں اس کی فکری صلاحیتوں کی پوری پوری نشو ونما نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں اس قسم کی "مذہب پرست" قومیں عقل و فکر کے میدان میں ہمیشہ ان قوموں سے پیچھے رہ جاتی ہیں جو تنہا عقل کو کشود کار کا ذریعہ سمجھتی ہیں اور کھلے بندوں اس کا اعلان کرتی ہیں۔ ان میں "ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر" کی کشاکش (INHIBITION) نہیں ہوتی۔

یہ ہے اس وقت ملک کی عام حالت۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس حقیقت پر پورا پورا الیقین ہے کہ وحی کی راہنمائی ان مشکلات کا حل بھی عطا کر دیتی ہے۔ جن سے عہدہ برآ ہونا تنہا عقل کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یعنی وحیٔ خداوندی عقلِ انسانی کے دائرہ کو اور وسیع کر دیتی ہے۔ جس مقام پر عقلِ انسانی کے چراغ ٹمٹمانے لگتے ہیں۔ وہاں وحیٔ خداوندی کا خورشید جہانتاب جلوہ بار ہو کر انسان کے ذہنی افق کو مطلعِ انوار بنا دیتا ہے۔ لہٰذا جس مقام پر اور لوگ بالکل ہار تھک کر بیٹھ جاتے ہیں ہم وہاں بھی قطعاً مایوس نہیں ہوتے۔ اس حقیقت کو قرآن نے قصۂ آدم کے تمثیلی رنگ میں بڑے حسن کارانہ انداز سے بیان کیا ہے

(اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ قصۂ آدم درحقیقت خود آدمی ہی کی داستان ہے) وہ کہتا ہے کہ جب اپنی غلط روش کی بنا پر آدم سے جنت چھن گئی تو وہ بہت مایوس ہو گیا۔ اس لئے کہ وہ اس اقتدار سے تنہا عقل (ابلیس) کی مدد سے بچنا چاہتا تھا اور یہ چیز تنہا عقل کی دسترس سے باہر کی تھی۔ اس پر آدم نے خدا سے کہا کہ کیا میری یہ پستی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایسی ہی رہے گی؟ کیا میں اب ابدی طور پر خاسر و نامراد ہو چکا ہوں؟ کیا یہ فردوسِ گم گشتہ مجھے دوبارہ کبھی نہیں مل سکے گا؟ کیا میری بازآفرینی کی اب کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکیگی؟ جواب ملا کہ نہیں! تمہارے لئے ابدی طور پر مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ تمہاری مایوسی پھر سے امیدوں میں اور تمہاری پستی عزّ و جاہ میں بدل سکتی ہے۔ اس سے آدم کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اور اس نے پوچھا کہ وہ کیسے؟ جواب ملا کہ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (۲/۳۸) میری طرف سے تمہارے پاس راہ نمائی آتی رہے گی۔ سو جو لوگ اس راہ نمائی کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ اس حقیقت کو قرآن نے خود امت محمدیہ کی داستان کے سلسلہ میں دہرایا ہے۔ سورۂ آل عمران میں پہلے یہ کہا گیا کہ یاد رکھو! انسان کے لئے کامیابی و کامرانی کی ایک ہی راہ ہے اور وہ راہ ہے اس ضابطۂ حیات کی اتباع جسے دینِ خداوندی (یا الاسلام) کہا جاتا ہے۔ جو شخص اس شاہراہِ حیات سے ہٹ کر کوئی اور نظامِ زندگی اختیار کرے گا تو کائنات کی میزان میں اس کی اس روش کا کوئی وزن نہیں ہوگا اور اس کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے گا (وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۳/۸۴)) اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ جو قوم ایک بار اس صحیح راستہ پر چل کر اسے چھوڑ دے تو اس کی حالت کیا ہوگی؟ اس کی حالت یہ ہوگی کہ اسے کامرانیوں کی راہ کبھی نہیں مل سکیگی۔ كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ۔ ذرا سوچو کہ خدا کا قانونِ ہدایت، بھلا اس قوم کو راہ نمائی کس طرح دیگا جو ایک دفعہ اس پر ایمان لا کر پھر اس سے انکار کر دے۔ راہ نمائی کے لئے شرط تو یہ ہے کہ اس کی محکمیت پر مسلسل ایمان رہے جسے اس پر ایمان ہی نہ رہے۔ وہ قوم اس کی نفع بخشیوں سے فیضیاب کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور پھر اس نے کفر کی راہ بھی اس حالت کے بعد اختیار کی ہو کہ اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیا تھا کہ جب خدا کے رسول نے اس دین کو عملاً متشکل کیا تھا تو وہ تمام نمادی جو اس نے اس قوم سے کر رکھے تھے۔ کس طرح ایک ایک کر کے پورے ہوئے تھے (وَشَهِدُوا أَنَّ الرَّسُولَ حَقٌّ) اور ان کے پاس وحی کا ضابطۂ حیات کھلے کھلے طور پر آ چکا تھا (وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ) اس قسم کی ظالم قوم کو خدا کی راہ نمائی کیسے مل سکتی ہے (وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (۳/۸۵)) اس کے بعد یہ کہا کہ اس قوم کی اس روگردانی کا نتیجہ کیا ہوگا؟ أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ خَالِدِينَ فِيهَا۔ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ (۳/۸۶-۸۷) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ قوم ان برکات سے بھی محروم ہو جائیگی جو نظامِ خداوندی کی رو سے حاصل ہوتی تھیں۔ اور ان مفادات سے بھی محروم جو فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے سے مل سکتی تھیں۔ اور اس تائید و تقویت سے بھی محروم۔ جو دوسروں قوم سے برابری کے ہمدردانہ معاملات سے میسر آ سکتی تھی۔ وہ ذلت و پستی کے

اس عذاب میں مبتلا رہے گی۔ اس عذاب کی سختی میں اس بنا پر ذرا بھی کمی نہیں ہوگی کہ وہ زبان سے خدا اور رسول پر ایمان کی مدعی تھی اور نہ ہی ان کی اس غلط روش کے نتائج میں تاخیر کی جائے گی کہ وہ اس دنیا میں موداہنہ ہوں۔ آخرت ہی میں جاکر سامنے آئیں۔

غور کیجئے کہ کیا قرآن نے ان آیات میں ہوبہو ہماری تصویر کھینچ کر نہیں رکھدی؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ داستان ہے ہی ہماری اپنی۔ ہمیں وہ ہیں جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کی روش اختیار کرلی۔ حالانکہ ہم اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرچکے تھے کہ اس ایمان کے نتائج کس قدر درخشندہ تھے۔ اور آج بھی اس امر کی شہادت بہم پہنچاتے رہتے ہیں۔ کیونکہ ہم برمنبر اور برسرِ اسٹیج ببانگ دہل اعلان کرتے رہتے ہیں کہ جب (صدر اول کے) مسلمانوں نے قرآن پر عمل کیا تو وہ کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے ساری دنیا پر چھا گئے۔ لیکن ہماری یہ شہادت محض لفاظی تک محدود ہوتی ہے۔ ہم دل سے وحی کی اس حیات بخش قوت پر ایمان نہیں رکھتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہماری یہ محرومی ابدی ہوچکی ہے۔ یا اس سے رستگاری کی کوئی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ ہاں! ہوسکتی ہے۔ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ۔ ہاں! اس عذاب سے وہ لوگ بچ جائیں گے جو اس مقام پر لوٹ کر آجائیں گے۔ جہاں سے ان کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا تھا۔ وہاں جاکر پھر سے صحیح راستہ پر گامزن ہوجائیں گے وَاَصْلَحُوْا اور اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیتیں پیدا کرلیں گے۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو خدا کا نظام ہر قسم کی تباہیوں سے ان کی حفاظت بھی کرے گا۔ اور ان کی نشوونما کا سامان بھی بہم پہنچائے گا۔ فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۳/۸۹)

یہ ہے وہ شعاعِ امید جو موجودہ حالات کی گھٹا ٹوپ تاریکیوں میں ہمیں افقِ قرآن سے بابِ ہم تابنا کی ودرخشانی ملتی ہے قرآن کے اس دعوے پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ ایمان نہ تو ملا کے اس ایمان کی طرح ہے جس کا عملاً مفہوم کچھ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی لیڈران قوم کے ایمان جیسا ہے جس سے تقریر میں گرمجوشی پیدا کرنے سے زیادہ کچھ مقصود نہیں ہوتا۔ ہمارا یہ ایمان علیٰ وجہ البصیرت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی متلاشی ہو تو ہم لے قرآن سے پورا پروگرام مرتب کرکے دے سکتے ہیں۔ جو ہمیں ہماری مشکلات کے جہنم سے نکال کر کامیابی وکامرانی کی منزل کی طرف لے جاسکتا ہے۔ ہم یہ دعوے دل کے پورے اطمینان اور ذہن کے پورے اعتماد سے کرتے ہیں۔ اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ (۸۶/۱۳-۱۴)

اور یہی ہے روشنی کا وہ بلند مینار جو حوصلہ شکن اور یاس انگیز حالات کے بحرِ ظلمات میں ہمارے لئے اپنے اندر نویدِ حیات اور پیام امید رکھتا ہے اور لب ہائے شکوہ سنج وشکایت آمیز کو زمزمہ بار شکر ریز بنا دیتا ہے۔ یہی ہے وہ نشیدِ جانفزا جسے سنکر ہم بے اختیار پکار اٹھتے ہیں کہ

مژدہ صبح دریں تیرہ شبانم دادند ... شمع کشتند وز خورشید نشانم دادند
رخ کشودند ولب ہرزہ سرایم بستند ... دل ربودند ودو چشم نگرانم دادند

قَدْ جَآءَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ نُوْرٌ وَّکِتٰبٌ مُّبِیْنٌ یَّھْدِیْ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَیُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ بِاِذْنِہٖ وَیَھْدِیْھِمْ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵/۱۶)

طلوعِ اسلام کنونشن

اگست ۱۹۵۶ء کے شمارہ میں یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے اس امر کا انتظام کیا جا رہا ہے کہ ۱۷، ۱۸ نومبر کو لاہور میں مغربی پاکستان کی بزم ہائے طلوع اسلام کے نمائندگان کا ایک مشاورتی اجتماع (کنونشن) منعقد کیا جائے۔ جس میں غور کیا جائے کہ اس فکر کو زیادہ سے زیادہ انسانوں تک پہنچانے کے لئے کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔

اس سلسلہ میں سکریٹری بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے جو مزید اطلاع ملی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ طلوع اسلام سے دلچسپی لینے والے حلقوں میں اس تجویز پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور مختلف شہروں کی بزموں کی طرف سے مختلف تجاویز اور ایجنڈا میں شامل کرنے کے لئے مختلف سوالات موصول ہو رہے ہیں۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

جن حلقوں نے ابھی تک اس سلسلہ میں کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ اپنے فیصلے سے جلد از جلد بزم طلوع اسلام ۲۴۔ نسبت روڈ لاہور کو مطلع کریں۔

بزم مذکور نے طلوع اسلام کے معاونین (یعنی پیشگی خریداران) کو الگ خط لکھا ہے۔ جس میں ان سے بھی تعاون کی درخواست کی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ حضرات بھی اس مقصد کو کامیاب بنانے میں تامل سے کام نہیں لیں گے۔

اس سلسلہ میں مزید اعلان اکتوبر کے طلوع اسلام میں کیا جائے گا۔ خط و کتابت کا پتہ ایک بار پھر نوٹ کر لیجئے۔

سکریٹری بزم طلوع اسلام
۲۴۔ نسبت روڈ لاہور

بزمہائے طلوعِ اسلام

کوئٹہ — محمد حنیف صاحب ترجمان بزم طلوع اسلام کوئٹہ تحریر فرماتے ہیں کہ ہم نے یہاں ایک بزم کی تشکیل کر لی ہے۔ لہٰذا اس علاقہ میں طلوع اسلام تحریک سے دلچسپی رکھنے والے احباب بزم طلوع اسلام جناح روڈ کوئٹہ سے رجوع فرمائیں۔

منٹگمری — غلام احمد خاں صاحب جالندھری ترجمان بزم طلوع اسلام منٹگمری تحریر فرماتے ہیں کہ یہاں منٹگمری میں بزم طلوع اسلام قائم کر لی گئی ہے۔ لہٰذا طلوع اسلام کی تحریک سے دلچسپی لینے والے احباب بزم طلوع اسلام عقب سٹی چرچ منٹگمری سے رجوع فرمائیں۔

سکھر — محبوب علی شاہ بخاری صاحب سکھر سے تحریر فرماتے ہیں کہ سکھر میں بزم طلوع اسلام قائم کی جا چکی ہے جو طلوع اسلام کی تحریک سے دلچسپی رکھنے والے حضرات محبوب علی شاہ بخاری سکریٹری بزم طلوع اسلام ضلع سکھر مالک سرور انجینئرنگ ہاؤس بالمقابل ڈیما فلور ملز بجبٹ روڈ سکھر سے رجوع فرمائیں۔

عربی زبان کی ایک شہرۂ آفاق کتاب

کا

اُردو ترجمہ

مصر کے جدید اسکالر، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا نام اسلامی اور علمی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھیں اگرچہ مختلف شعبہ ہائے علم میں قابلِ قدر دستگاہ حاصل ہے۔ لیکن جدید اصولوں کے مطابق تاریخ نگاری ان کی ایسی خصوصیت ہے جس کی مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔ انھوں نے اپنی اسی خصوصیت کے مطابق آج سے کچھ عرصہ پہلے

"الفتنۃ الکبریٰ"

کے نام سے ایک بلند پایہ کتاب لکھی تھی۔ جس نے علمی دنیا میں بڑی شہرت حاصل کر لی۔ اس کتاب میں انھوں نے ان تمام فتنوں کا نو رخانہ نگاہ سے جائزہ لیا ہے جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اور اس کے بعد عالم میں پھیلے اور جن کی وجہ سے اُمتِ مسلمہ کو وہ کچھ دیکھنا پڑا جس پر ہر چشمِ بصیرت آج تک اشکبار ہے

اردو داں طبقہ کے لئے یہ خبر بڑی مسرت انگیز ہو گی کہ ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے

اس کتاب کا اردو ترجمہ

عنقریب شائع ہو گا۔ ترجمہ مکمل ہو چکا ہے۔ اور بہت جلد پریس میں چلا جائے گا۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

۱۵۹/۳ اے۔ پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی ۲۹۔

باسمہٖ تعالیٰ

قرآن کی رُو سے

عُلماء کون ہیں؟

(ارباب فکر و نظر کے لئے ایک بصیرت افروز اور حقیقت کشا مقالہ، جسے محترم پرویز صاحب نے "سلیم کے نام خطوط" کے دلکش انداز میں لکھا)

شائع کردہ

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

۱۵۹/۳ ۔ ایل (پی ۔ ای ۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی) کراچی نمبر ۲۹

سلیم کے نام

علماء کون ہیں؟

اس میں کوئی شبہ نہیں سلیم! کہ علم وجۂ شرفِ انسانیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ علم کہتے کسے ہیں اور علماء کون ہیں؟ قرآن نے اس سوال کا جواب بڑا جامع اور مفصل دیا ہے۔ لیکن اس تک پہنچنے سے پہلے چند الفاظ تمہید اً ضروری ہیں۔ انہیں غور سے سننا۔

علم کی دنیا میں حکمائے یونان کا جو مقام ہے، اس سے تم واقف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت تک انسانیت کی جس قدر تاریخ ہمارے سامنے آچکی ہے اس میں علم و حکمت کی داستان کا آغاز ہی درسگاہِ یونان سے ہوتا ہے۔ ان میں سقراط (SOCRATES) کو ابوالآباء اور افلاطون (PLATO) کو اس کے بہترین شارح، اور بجائے خویش ایک مکتبِ فکر کے موسس کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن سقراط صرف انسان کو قابلِ مطالعہ سمجھتا ہے۔ کائنات کو نہیں۔ اور افلاطون عالمِ محسوس کے وجود پر ہی خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس (CONCRETE) دکھائی دیتی ہے اپنا وجود ہی نہیں رکھتی۔ اصلی اور حقیقی کائنات عالمِ مثال (WORLD OF IDEAS) میں ہے اور یہ مرئی (VISIBLE) کائنات اس حقیقی دنیا کا عکس ہے۔ لہٰذا اس کائنات کے متعلق جو علم، حواس (SENSES) کے ذریعے حاصل کیا جائے۔ یعنی (PERCEPTUAL KNOWLEDGE) وہ قابلِ اعتماد ہی نہیں یقینی علم وہ ہے جو آنکھیں اور کان بند کر کے، عالمِ تصور میں حاصل کیا جائے۔ افلاطون کا یہی فلسفہ ہے جس پر یونانی تصوف کی عمارت استوار ہوئی۔ اسی نے ہندوستان میں پہنچ کر ویدانت کی شکل اختیار کی۔ چنانچہ ہندو فلسفہ کی رو سے پراکرتی (مادی دنیا) مایا (فریب) ہے۔ یہ سب برہما کا سپنا (خدا کا خواب) ہے۔ یہ ایشور کی لیلا ہے۔ یعنی ناٹک کا کھیل جس میں کوئی شے حقیقی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت کی تمثیل ہوتی ہے۔ نہ بادشاہ بادشاہ ہوتا ہے۔ نہ غلام غلام۔ نہ دریا، دریا ہوتا ہے۔ نہ پہاڑ، پہاڑ۔ یہ سب فریبِ نگاہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ہندو فلسفہ میں خدا کو نٹ راجن کہا جاتا ہے۔ یعنی نٹوں (ایکٹروں، کھلاڑیوں) کا بادشاہ۔ اس مقام پر ضمناً یہ بھی سمجھ لو سلیم! کائنات کو اس طرح باطل قرار دینے کا نتیجہ تھا کہ اس کی طرف سے انسان کے دل میں منفی اسلوب (NEGATIVE ATTITUDE) پیدا ہو جائے۔ یہی منفیانہ اندازِ نگاہ تھا کہ جس نے خدا پرست انسانوں کی نگاہ میں دنیا کو قابلِ نفرت بنا دیا۔ یہی فلسفہ ہے جو ایرانی تصوف کے راستے مسلمانوں میں بھی آ گیا۔ اور ان کی زندگی کے ہر گوشہ کو متاثر (اور مسموم) کر گیا۔ ہمارے تصوف کی ساری عمارت اسی بنیاد پر قائم ہے، اور ہماری شاعری چونکہ اسی تصوف کی نقیب ہے اس لئے ہمیں بھی قدم قدم پر اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ کبھی سقراط کے اتباع

میں یہ کہا جاتا ہے کہ

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو سمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ درِ دل کشا بہ چمن درا (بیدلؔ)

اور کبھی افلاطون کے تتبع میں یہ کہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اسی سے ہمارے ہاں بھی دنیا قابلِ نفرت بھی جانے لگی (یہ الگ موضوع ہے۔ جس کے متعلق میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں)

بہرحال سلیم! میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآن سے پہلے کائنات سے متعلق نظریہ یہ تھا کہ اس کا حقیقی وجود کچھ نہیں۔ یہ محض فریبِ تخیل ہے۔ سراب ہے، سایہ ہے۔ وہم ہے۔ گمان ہے اور جب کائنات وہم و فریب ہے۔ تو اس کے متعلق علم بھی درحقیقت علم نہیں، ظن و گمان ہے۔ قرآن آیا۔ اور اس نے (ہر باطل تصور کی طرح) افلاطون کے اس طلسم کی بھی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اس نے تصوف اور ویدانت کے نظر فریب تخیلات میں الجھی ہوئی انسانیت کو للکار کر پکارا اور کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ ہم نے اسے باطل پیدا نہیں کیا۔

قرآن کا چیلنج

ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِينَ كَفَرُوا۔ یہ ان لوگوں کا ظن و خیال اور وہم و گمان ہے جو حقیقت سے انکار کرتے ہیں فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنَ النَّارِ (۳۸/۲۷)۔ اور جو لوگ اتنی بڑی حقیقت سے انکار کریں۔ (اور دنیا کو باطل اور قابلِ نفرت ٹھرا دیں) قرآن کے اس انکار کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کی سعی و عمل کی کھیتیاں جھلس کر رہ جائیں۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے ایک آیت میں، صدیوں کے غلط تصور کو کس طرح جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا۔ اور اس کے انسانیت سوز نتائج کو کس طرح بے نقاب کر دیا ہے! پھر اس پر بھی غور کرو کہ قرآن نے، کائنات کو باطل قرار دینے اور اس کی طرف سے منفیانہ تصور رکھنے والوں کو "کافر" کہہ کر پکارا ہے۔ تم نے سوچا کہ قرآن کی رُو سے کفر اور ایمان کی حدیں کہاں تک چلی جاتی ہیں۔ اور کافر و مومن کے امتیازی خصائص کیا ہیں؟ اور پھر یہ جو کہا کہ اس قسم کے منفیانہ اندازِ نگاہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانیت کی مزرعِ ہستی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ تو یہ کتنی بڑی تاریخی حقیقت کا بیان ہے؟ کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ کا مظہر مسلکِ خانقاہیت ہے۔ (اسی کو ویدانت اور تصوف کہتے ہیں) تم اس مسلک کی تاریخ پر غور کرو اور دیکھو کہ اس راستے میں انسانوں نے جس قدر جانکاہ مشقتیں اٹھائی ہیں اور جس طلب ریاضتیں کیں، ان کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلا کہ انسان کی عمرانی زندگی کی ہری بھری شاخیں جھلس کر رہ گئیں۔

یہ تو تھا کائنات کو باطل قرار دینے والوں کے خلاف اعلانِ جنگ۔ اس کے بعد مثبتانہ انداز میں کہا کہ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا نے اس پست و بلند کائنات کو بالحق پیدا کیا ہے۔ کائنات حقیقت پر مبنی (R3AL) ہے۔ فریبِ تخیل نہیں۔ یہ تعمیری مقاصد کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ تخریبی نتائج کے لئے نہیں اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (۲۹/۴۴)۔ اس انکشافِ حقیقت

میں جو قرآن نے کیا ہے، علم و آگہی کی بہت بڑی نشانی ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ دیکھو سلیم! سابقہ آیت میں کائنات کو باطل قرار دینے والوں کو کافر کہا گیا تھا۔ زیرِ نظر آیت میں اسے حق سمجھنے والوں کو مومن قرار دیا گیا ہے۔ دیکھا تم نے سلیم! کہ قرآن کس طرح اپنے مطالب کو خود ہی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔

کائنات کو "ایشور کی لیلا" قرار دینے والوں کے نظریہ کے ابطال میں کہا کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ (۲۱/۱۶)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے اسے یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ تخلیقِ کائنات ایک نہایت اہم (SERIOUS) پروگرام کا جزو ہے۔ کھیل تماشہ نہیں۔ اسے بالحق پیدا کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اپنے اس دعوے کو (کہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے) یونہی منوانا چاہتا ہے یا علم و برہان کی رو سے تسلیم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو علم و برہان کی بنیادوں پر پیش کرتا اور فکر و بصیرت کی رو سے ماننے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بھی اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (۱۰/۵)۔ ہم ان حقائق کو ان لوگوں کے لئے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں، جو علم رکھتے ہیں۔

علم کی قرآنی تعریف

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ علم کسے کہتے ہیں؟ سنو سلیم! قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ یاد رکھو کہ جس بات کا تمہیں علم نہ ہو، اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ آیت کا اتنا حصہ بھی کچھ کم حقیقت کشا اور بصیرت افروز نہیں۔ لیکن اس کے بعد کے چند الفاظ نے علم کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) دے دی ہے۔ جس سے ساری بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ فرمایا۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۶)۔ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری سماعت، بصارت اور فواد۔ ہر ایک پر ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ تم نے سمجھا سلیم! کہ بات کیا ہوئی؟ قرآن سمع (سننے) اور بصر (نگہ بصیرت سے دیکھنے) کو انسانی حواس (SENSES) کے معنوں میں استعمال کرتا ہے۔ اور فواد وہ چیز ہے جسے دورِ حاضر کی اصطلاح میں (MIND) کہا جاتا ہے۔ انسانی حواس (سمع و بصر) معلومات (DATTA) فراہم کر کے انسانی فواد (MIND) تک پہنچاتی ہیں اور فواد ان سے استنباطِ نتائج کرتا ہے۔ تم کارتوس کی آواز سنتے ہو تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچتے ہو کہ کسی نے بندوق چلائی۔ اس کے بعد چیخ کی آواز سنتے ہو تو سمجھ لیتے ہو کہ کسی کے گولی لگ گئی۔ اور باہر جا کر دیکھتے ہو کہ جسے گولی لگی ہے وہ تمہارا دوست ہے تو گولی چلانے والے کے خلاف تمہارے دل میں آتشِ انتقام بھڑک اٹھتی ہے۔ اس تمام واقعہ میں تمہارے سمع و بصر و فواد کی شہادت موجود ہے۔ لہٰذا یہ علم ہے۔ لیکن اگر تم نہ بندوق کی آواز سنو۔ نہ کسی کی چیخ۔ نہ اپنے دوست کو تڑپتا دیکھو۔ نہ کسی گولی چلانے والے کو۔ اور یونہی کسی کی بات سن کر ایک شخص کی جان کے لاگو ہو جاؤ تو تمہارا یہ فعل علم پر مبنی نہیں ہوگا۔ کیونکہ اس میں تمہارے سمع و بصر کی شہادت موجود نہیں۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن علم کے بارے میں حواس (SENSE PERCEPTION) کو کس قدر اہمیت دیتا ہے۔ یہ دوسری ضرب ہے جو وہ افلاطونی تصور کے خلاف لگاتا ہے۔ اور اسے پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ حواس کے ذریعے حاصل کردہ علم پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے کہا کہ جس بات کی شہادت، سمع و بصر نہ دے وہ علم پر مبنی ہی نہیں۔ لیکن صرف سمع و بصر ہی نہیں، بلکہ ان کے ساتھ فواد بھی۔

سمع و بصر سے کام نہ لینے والے

سمع و بصر و قلب کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر قرآن نے صاف الفاظ میں کہدیا کہ جو لوگ ان سے کام نہیں لیتے۔ وہ انسانی سطح پر نہیں بلکہ حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ انہیں جہنمی قرار دیتا ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ۔ جن و انس (شہری اور صحرائی آبادیوں کے) میں اکثر وہ لوگ ہیں جو اس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں جو انہیں سیدھی جہنم کی طرف لے جاتی ہے لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ ان کی روش یہ ہے کہ وہ سینے میں دل رکھتے ہیں لیکن ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وہ آنکھیں رکھتے ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا وہ کان رکھتے ہیں۔ لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ۔ یہ انسان نہیں حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ گم کردہ راہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۷/۱۷۹) یہ علم و حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں۔ اس سے بھی واضح ہے کہ علم وہی علم ہے۔ جس کی شہادت سمع و بصر و قلب دے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا علم نظری مباحث (THEORETICAL PROBLEMS) کے متعلق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ایسے امور میں سمع و بصر کا کوئی واسطہ ہی نہیں ہوتا۔ سمع و بصر کا تعلق مظاہرِ فطرت کے مشاہدات اور کائناتی نظام کے مطالعہ سے ہے۔ یعنی کائنات کے ایک ایک گوشے کو غور و فکر سے دیکھنا۔ اس عظیم القدر اور محیر العقول مشینری کے ایک ایک پرزے کا مشاہدہ کرنا۔ پھر مختلف تجربات کی رو سے یہ دیکھنا کہ ان پرزوں کی ساخت و پرداخت میں کون سا قانون اور ان کی نقل و حرکت میں کونسی اسکیم کارفرما ہے۔ اسی کو دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں علم سائنس (SCIENTIFIC KNOWLEDGE) کہتے ہیں۔ اور اسی کو قرآن مومنین کا شعار بتاتا ہے۔ غور کرو کہ تسلیم کہ قرآن اس حقیقت کو کس قدر واضح اور حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ یقیناً اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق اور رات اور دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و شعور کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں (یہاں ایک بات کا ضمناً سمجھ لینا ضروری ہے۔ ایک چیز تو ہے کائنات کا عدم سے وجود میں آنا اسے قرآن نے بدع اور فطر سے تعبیر کیا ہے اور دوسری چیز ہے موجود عناصر میں مختلف تراکیب و تناسب سے مختلف چیزیں بناتے چلے جانا اسے علم طور پر تخلیق کہا گیا ہے۔ خلق کے معنی صحیح صحیح تناسب کے ہیں۔ خلق کا لفظ خود اسی مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ خلق سے مراد ہے انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کا ٹھیک ٹھیک توازن رکھنا۔ ان کا حالتِ اعتدال پر ہونا۔ نبی اکرمؐ کے متعلق جو فرمایا کہ إِنَّكَ لَعَلَىٰ خُلُقٍ عَظِيمٍ (۶۸/۴) تو اس سے یہی مراد ہے کہ حضورؐ شرفِ انسانیت کے اس بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ جہاں تمام انسانی صلاحیتیں انتہائی توازن و تناسب کے ساتھ یکجا جمع ہیں۔ بنا بریں تخلیقِ ارض و سماء سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں مختلف عناصر میں تراکیب ہوتی ہے جو مختلف تغیرات رونما ہوتے ہیں اور نئی نئی چیزیں ظہور میں آتی ہیں۔ ان پر غور و فکر کرنے سے کائناتی پروگرام اور قانونِ فطرت کی بڑی بڑی عظیم نشانیاں سامنے آ جاتی ہیں۔ میں نے اس تشریح کو اس لئے ضروری سمجھا ہے کہ انسانی فکر کچھ نہیں بتا سکتا کہ کائنات کس طرح عدم سے وجود میں آ گئی۔ یہ وہ مقام ہے جو فکرِ انسانی کی حدود سے ماوراء ہے۔ لہٰذا قرآن نے اس مقام کے متعلق فکر و تدبر کی دعوت نہیں دی۔ فکر و تدبر کا مقام وہاں سے شروع ہوتا ہے۔ جہاں اس محسوس کائنات کے تغیرات اور حوادث ہمارے مشاہدہ میں آتے ہیں۔ بہرحال) قرآن نے کہا یہ

ہے کہ تخلیقِ ارض و سما اور اختلافِ لیل و نہار میں اربابِ دانش و بینش کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ کن اربابِ دانش کے لئے؟

خدا کا ذکر کرنے والے

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ ان کے لئے جو اٹھتے۔ بیٹھتے لیٹے ہر وقت قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی تخلیقِ ارض و سما میں غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور اپنے مشاہدات و تجارب کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے کائنات کی کسی شے کو بیکار یا تخریبی نتائج کے لئے پیدا نہیں کیا۔ غور کیا سلیم! کہ یہ کتنی بڑی بات ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ قرآن کا یہ دعوےٰ ہے کہ کائنات کی کوئی شے عبث و بیکار ہے اور نہ محض تخریبی نتائج کے لئے وجود میں لائی گئی ہے۔ ہر شے ایک متعین مقصد رکھتی ہے اور نوعِ انسانی کے لئے کسی نہ کسی پہلو سے نفع بخش ہے۔ لیکن قرآن کا یہ مقصد نہیں کہ ہم اس کے اس دعوےٰ کو یونہی مانتے رہیں۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ ہے کہ تم کائنات کی ایک ایک چیز پر غور کرو اور مسلسل مشاہدات اور پیہم تجربات کے بعد ان کے متعلق یہ ثابت کرو کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سوچو سلیم! یہ کتنا بڑا پروگرام ہے جو قرآن نے جماعتِ مومنین کے سامنے رکھا ہے۔ یہ کتنی عظیم ذمہ داری ہے جو ان پر عائد کی گئی ہے۔ کائنات کی ہر شے کے متعلق عملاً ثابت کرنا کہ وہ فلاں فائدہ کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ یہ ہے قرآن ماننے والوں کا فریضہ! غور کرو کہ اس کے لئے کس قدر وسیع اور عمیق سائنٹیفک تحقیقات کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے کتنی بڑی بڑی معمل LABORATORIES درکار ہیں تمہیں یاد ہے کہ اگلے دنوں جاوید تم سے پوچھتا تھا کہ ابا جان! اللہ میاں نے بھڑوں کو کاہے کے لئے بنا دیا ہے۔ یہ تو ہر ایک کو کاٹتی پھرتی ہیں اور بھلے چنگے آدمی کا منہ سُجا دیتی ہیں! بالآخر ان سے فائدہ کیا ہے؟ ان کا فائدہ نہ تم بتا سکتے تھے نہ کوئی اور۔ لیکن اگلے دنوں جنوبی امریکہ سے ایک خبر آئی کہ وہاں ایک قسم کا کیڑا پیدا ہوتا ہے جو بعض قیمتی پودوں کو سخت نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کا کوئی علاج ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر مسلسل مشاہدات کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان کیڑوں کو بھڑیں کھا جاتی ہیں۔ اب انہوں نے مختلف گرم ممالک سے بھڑیں جمع کر کے اپنے ملک میں پھیلانا شروع کر دیا ہے۔ یہ ہیں وہ لوگ جو سلیم! علیٰ وجہ البصیرت پورے حتم و یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا اے کائنات کے نشو و نما دینے والے! تو نے بھڑوں کو بھی تخریبی کاموں کے لئے پیدا نہیں کیا۔ یہ بھی کائنات کی نشو و نما میں تعمیری کام کرتی ہیں سُبْحٰنَکَ تو اس سے بہت دور ہے کہ کسی شے کو محض تخریب کے لئے پیدا کرے۔ یہ چیز تیری شانِ ربوبیت سے بہت بعید ہے۔ یہ تو ہماری کم علمی اور سائنٹیفک تحقیقات کا فقدان ہے۔ جو ہم ان کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر، لہٰذا ان کی زہر پاشیوں سے جھلستے اور تڑپتے رہتے ہیں۔ ہماری آرزو یہ ہے کہ تو ہمیں ان تحقیقات کی توفیق عطا فرما تاکہ ہم اس قسم کے دردناک عذاب سے محفوظ رہیں فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ اس لئے کہ جو قومیں اس قسم کی تحقیقات RESEARCHES سے اشیائے کائنات کے نفع بخش پہلوؤں سے بے خبر رہتی ہیں، وہ تسخیرِ فطرت نہیں کر سکتیں۔ لہٰذا دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہیں۔ رَبَّنَآ اِنَّکَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ اور پھر ان ظالمین کا دنیا میں کوئی یار و مددگار نہیں ہوتا وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۳/۱۹۲)۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے اس ایک آیت میں کتنی بڑی حقیقتوں کو بیان کر دیا ہے۔ بہرحال، بات یہ ہو رہی تھی کہ قرآن کی رو سے امتِ مسلمہ اور جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ

کائنات کی ایک ایک چیز کا مشاہدہ کریں۔ اور پیہم تجربات سے ان کے منفعت بخش پہلوؤں کو بے نقاب کیے جائیں۔ اسی کو قرآن نے "ذکر و فکر" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی کائناتی قوانین کو اپنے سامنے رکھنا۔ اور ان میں ہر آن غور و تدبر

کائنات میں آیات اللہ

کرتے رہنا یہی مومنین کا شعار تھا اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ (۴۵:۳)، مومنین کے لئے کائنات کے ہر گوشے میں آیات خداوندی بکھری پڑی ہیں۔ انہی سے انسان کو خدا کی خداوندی کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ وَفِیْ خَلْقِکُمْ وَمَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّۃٍ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ (۴۵:۴) اور خود تمہاری تخلیق اور دوسرے حیوانات کی افزائش نسل میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو قانون خداوندی پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَتَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ (۴۵:۵) اور رات اور دن کی گردش میں۔ اور اس بارش میں جو بادلوں سے برستی ہے۔ اور ہر جاندار کے لئے اپنے اندر نشوونما کا سامان رکھتی ہے۔ اور جو زمین مردہ کو از سر نو زندگی عطا کرتی ہے۔ اور ان ہواؤں میں جو مختلف موسموں میں مختلف سمتوں میں چلتی ہیں۔ ان تمام مظاہر فطرت میں اس قوم کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہے۔ ان حقائق کے بیان کرنے کے بعد قرآن ایک ایسی عظیم حقیقت کو سامنے لاتا ہے۔ جس سے بیک وقت حیرت و بصیرت پیدا ہو جاتی ہے۔ فرمایا تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ۔ یہ وہ آیات ہیں جنہیں ہم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (۴۵:۶) سو جو لوگ اللہ اور اس کی اس قسم کی آیات پر بھی ایمان نہیں لاتے تو پھر ان کے سامنے اور کون سی حقیقت ایسی آئے گی جس کی رو سے وہ خدا پر ایمان لائیں گے؟ یعنی اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ خدا پر ایمان لانے کے لئے مظاہر فطرت کا مشاہدہ اور اس کے کائناتی قوانین کا مطالعہ کرو۔ اگر کسی کو ان کے ذریعے بھی خدا پر ایمان حاصل نہیں ہوتا تو پھر کوئی اور حقیقت ایسی نہیں رہ جاتی جس سے اسے ایمان نصیب ہو سکے۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن شاہدۂ کائنات اور مطالعۂ فطرت پر کس قدر زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح اور علیٰ وجہ البصیرت ایمان حاصل ہی اسی سے ہوتا ہے۔ اسی سے

"خدا بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔"

میں نے جو یہ کہا ہے کہ اس سے "خدا بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے:" تو یہ محض شاعری نہیں کی۔ یہ قرآن کی آیت کا ترجمہ ہے ایک آیت کا نہیں۔ متعدد آیات میں یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔ ذرا کان کھول کر سنو اور سوچو کہ قرآن نے چند الفاظ میں کتنی بڑی حقیقت کو سمٹا کر رکھ دیا ہے۔

انسانی زندگی کا منتہیٰ کیا ہے؟ ایک خدا پرست انسان کی آخری آرزو کیا ہو سکتی ہے؟ احکام خداوندی کی پابندی سے انتہائی مقصود کیا ہے؟ ان سوالات کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ ہر خدا پرست کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اسے خدا مل جائے۔ اس کی اپنے

لقاءِ رب

رب سے ملاقات ہو جائے۔ اب دیکھو سلیم! قرآن اس کے لئے کیا طریق بتاتا ہے۔ سورہ رعد میں ہے اَللّٰهُ الَّذِیْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَیْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا اللہ کی ذات وہ ہے جس نے ایسے ایسے عظیم کروں کو فضا کی بلندیوں

میں بغیر کسی ایسے ستون کے جو تمہیں نظر آتے۔ اس حسن و خوبی سے اٹھا رکھا ہے۔ ضمناً اس آیت میں تَرَوْنَهَا کا لفظ غور طلب ہے۔ یعنی یہ کرّے اس فضا میں ستونوں کے سہارے قائم ہیں۔ لیکن وہ ستون ایسے نہیں جو تمہیں دکھائی دے سکیں وہ (VISIBLE) نہیں ہیں۔ یہ ستون وہ کشش ثقل و انجذاب ہے۔ جس سے یہ کرّے اس طرح فضا میں معلق ہیں اور کشش کی قوت ایسی چیز نہیں جو آنکھوں سے دکھائی دے سکے۔ اس ضمنی تشریح کے بعد پھر اصل آیت کی طرف آؤ۔ اس کا بقایا حصہ یہ ہے ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ اور وہ خدا اس تمام کائنات کے مرکزی کنٹرول کو اپنے ہاتھ میں رکھے ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ۔ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى اس نے چاند اور سورج کو اپنے قانون کی زنجیروں میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ وہ مقرر کردہ راستوں پر ایک وقت معین تک کے لئے بلا چوں و چرا چلے جاتے ہیں يُدَبِّرُ الْاَمْرَ۔ وہ خدا اپنے اس پروگرام کو حسن تدابیر سے چلائے جا رہا ہے يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ اور اپنی ان آیات کو تمہارے لئے کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ (۱۳/۲) تاکہ تم اپنے رب کی ملاقات کا پورا پورا یقین کر سکو۔ تم نے دیکھا سلیم! قرآن نے یہاں کیا کہا ہے؟ اس نے کہا یہ ہے کہ نظامِ کائنات کے متعلق یہ تمام تفصیلات اس لئے بیان کی جاتی ہیں کہ تمہیں اس بات کا یقین آجائے کہ تم اپنے رب سے مل سکتے ہو۔ تمہارا رب تمہارے سامنے آ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے کہ اگر تم اپنے رب کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم نظامِ کائنات کا مطالعہ کرو۔ ایک ایک شے پر غور و فکر کرو۔ مختلف تجربات سے اس حقیقت کا انکشاف کرو کہ یہ تمام سلسلہ کائنات کس محکم قانون کے مطابق چل رہا ہے۔ اس طرح وہ تمام پردے ایک ایک کر کے اٹھ جائیں گے۔ جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو سطح بین نگاہوں سے چھپائے رکھتے ہیں۔ اور تم علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لوگے کہ اس کا قانون ربّ العالمینی کس طرح کائنات کی نشو و نما کئے جا رہا ہے۔ اس طرح تم اپنے رب کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ لوگے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے آنکھوں سے دیکھ لینا تو ایک طرف، اس کا تصور بھی ذہن انسانی میں نہیں آ سکتا لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ (۶/۱۰۴) انسانی نگاہیں اسے پا ہی نہیں سکتیں۔ اس لئے "لقاء رب" کے یہ معنی نہیں کہ خدا کی ذات بے نقاب ہو کر انسان کے سامنے آ سکتی ہے۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ فطرت کے مشاہدہ سے خدا کا نظامِ ربوبیت انسان کے سامنے بے نقاب ہو کر آ جاتا ہے اور وہ اس کی ربّ العالمینی کی کارفرمائیوں اور کرشمہ سازیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت واضح ہے کہ قرآن کی رو سے "لقاء رب" کا یقین انہی کو آ سکتا ہے جو فطرت کا مشاہدہ کریں۔ لیکن اس کے لئے بڑی جد و جہد درکار ہوتی ہے۔ پیہم سعی و عمل اور مسلسل تگ و تاز کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے کبھی ہمالیہ کی چوٹیوں پر چڑھنا پڑتا ہے۔ اور کبھی بحرِ اٹلانٹک کی گہرائیوں میں اترنا۔ کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں جھلسنا پڑتا ہے۔ اور کبھی قطب شمالی کے برف پوش میدانوں میں ٹھٹھرنا۔ کبھی شیروں کے منہ میں ہاتھ دینا پڑتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو سانپوں سے ڈسوانا۔ کبھی ایک پتے کی تحقیق میں مہینوں وقفِ فکر و تدبر رہنا پڑتا ہے اور کبھی ایک جرثومہ کی تشریح میں برسوں محوِ مطالعہ و مشاہدہ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ کچھ وہی قومیں کر سکتی ہیں جو حاضر و موجود پر مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں بلکہ مستقبل کی فکر میں غلطاں و پیچاں رہیں۔ دیکھو سلیم! قرآن نے اس حقیقت کو کس قدر واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے اِنَّ فِي اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ۔ یقیناً دن اور رات کی گردش

اور کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ اس کی تخلیق میں تقویٰ شعار قوم کے لئے خدا کی آیات ہیں۔

متقی کون ہے

(ضمناً تم نے غور کیا سلیم! کہ خدا نے متقیوں کی کیا علامت بتائی ہے۔) اس کے بعد ہے اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ اس کے برعکس جو لوگ "ہماری ملاقات" کی توقع نہیں رکھتے جن کے دل میں اس کی آرزو موجزن نہیں ہوتی یعنی وہ لوگ جو پیش پا افتادہ مفاد، حال کی قریبی زندگی پر راضی ہو جاتے ہیں۔ وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا اور جو کچھ سامنے پڑا ہو اسی پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ یعنی وہ لوگ جو ہماری ان کائناتی نشانیوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۱۰/۸) یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال کی بدولت جہنم کے عذاب میں مبتلا رہتے ہیں۔ پہلے تو اس بات پر غور کرو سلیم! کہ قرآن کریم نے رَضُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا اور وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا سے کتنی بڑی حقیقت کی پردہ کشائی کی ہے۔ دنیا میں قوموں کی نکبت و زبوں حالی اور عروج و اقبال کا بنیادی راز کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ ایسی قومیں جو اس پر شاکر اور قانع ہو کر بیٹھ جائیں۔ جو انہیں آسانی سے میسر آرہا ہو۔ وہ ندرتِ فکر اور قوتِ عمل سے محروم ہو کر ذلت و پستی کے عمیق گڑھوں میں جا گرتی ہیں اور زندہ قوموں کی صفوں سے کہیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ان کے برعکس جو قومیں حاضر و موجود پر قانع نہیں رہتیں، بلکہ مسلسل محنت ومشقت سے نت نئی ایجادات اور نت نئے انکشافات کرتی رہتی ہیں۔ وہ مصافِ زندگی میں کہیں آگے نکل جاتی ہیں۔ یہ وہ قومیں ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھنے کے نشہ میں سرشار ہوتی ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ آسمان ان پر اپنی توانائیوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔ زمین اپنے چھپے ہوئے خزانے ان کے حوالے کر دیتی ہے۔ جو قومیں ایسا نہیں کرتیں وہ اس سامانِ ربوبیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَلِقَآئِهٖٓ اُولٰٓئِكَ يَئِسُوْا مِنْ رَّحْمَتِيْ

سامانِ ربوبیت سے محرومی

جو لوگ ان آیاتِ خداوندی اور ملاقاتِ ربی سے انکار کرتے ہیں وہ خدا کے عطا فرمودہ سامانِ نشوو ارتقاء سے محروم رہ جاتے ہیں۔ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۲۹/۲۳) یعنی یہ لوگ ایک دردانگیز عذاب کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ تم نے دیکھا سلیم! خدا کے سامانِ رحمت و ربوبیت سے محرومی کو قرآن نے عذاب الیم کہا ہے۔ اسی کو سورۂ آل عمران اور سورۂ یونس میں عذابِ نار سے تعبیر کیا گیا ہے (۳/۱۹۱، ۱۰/۸) یہ آیات پہلے لکھی جا چکی ہیں) ذرا سوچو کہ حجاز کے بے برگ و گیاہ صحرا کے نیچے ذہبِ سیّال (LIQUID GOLD) یعنی پٹرول کے دریا صدیوں سے بہہ رہے تھے۔ لیکن چونکہ وہ لوگ حاضر و موجود پر مطمئن تھے اس لئے وہ اس بیش بہا نعمتِ خداوندی کی نفع بخشیوں سے محروم تھے۔ نتیجہ اس کا یہ تھا کہ وہ لوگ نانِ شبینہ تک کے لئے دوسروں کی خیرات کے محتاج تھے۔ یہ خدا کا بہت بڑا عذاب تھا۔ (قرآن نے بھوک کو خدا کا عذاب کہا ہے (فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲)) اب اقوامِ مغرب کی نگہ خارا شگاف نے تہ میں پگھلے ہوئے سونے کے ان دریاؤں کا سراغ پالیا، اور اپنی مسلسل کوشش سے انہیں کھینچ کر باہر لے آئے۔ اس سے حجاز کا نقشہ بدل گیا۔ خود ہمارے خطۂ زمین (پاکستان) میں فطرت نے ممکنات (POTENTIALITIES) کی ایک دنیا چھپا رکھی ہے۔ لیکن ہم چونکہ حاضر و موجود پر مطمئن ہیں، اور بسا اوقات (جو کچھ محنت کے بغیر حاصل ہو جائے) پر شاکر و قانع۔ اس لئے روٹی تک کے لئے بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ یورپ کی بعض قوموں کے پاس چپہ چپہ بھر زمین ہے۔ لیکن وہ اسی زمین سے اتنا کچھ

پیدا کرتے ہیں کہ اپنی ضروریات پورا کرنے کے بعد دوسرے ملکوں کو بھی سامان زیست بھیجتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ فطرت کے مخفی خزانوں کو بے نقاب دیکھنے کے لئے مصروف سعی و عمل رہتے ہیں۔ ہم نے اس قانونِ خداوندی سے صدیوں سے اعراض برت رکھا ہے۔ اس لئے ہم پر ہماری معیشت تنگ ہو رہی ہے وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا (۲۰/۱۲۹) خدا کا کھلا ہوا فیصلہ ہے جو کسی کی خاطر بدل نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ مدت دراز سے اپنے سمع و بصر سے کام نہ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری یہ صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی ہیں۔ اور ہمارا شمار ان لوگوں میں ہو چکا ہے جن کے متعلق ارشاد ہے کہ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ (۱۶/۱۰۸) یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلوب اور سمع و بصر پہ مہریں لگ چکی ہیں۔ یہ لوگ ہماری آیات سے بالکل بے خبر ہیں۔

بعض کے نزدیک "لقاء رب" سے مراد یہ ہے کہ انسان مرنے کے بعد اپنے اعمال کی جزا و سزا کے لئے خدا کے سامنے جائے گا اگرچہ سیاق و سباق کے پیش نظر یہ مفہوم زیادہ موزوں نہیں۔ لیکن اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پر رہتی ہے کہ قرآن کی رو سے اس "لقاء رب" کے یقین کے لئے کائنات میں آیات اللہ کا مشاہدہ اور مطالعہ ضروری ہے

تم نے دیکھا سلیم! قرآن کس طرح مختلف انداز سے اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ

(۱) علم وہی علم ہے جس میں انسان اپنے حواس سے پورا پورا کام لے۔

(۲) حواس سے کام لینے سے مفہوم یہ ہے کہ انسان اس محسوس کائنات کے اسرار و غوامض سے پردہ کشائی کرے۔ اشیائے فطرت کا وسیع مشاہدہ کرے۔ قوانین فطرت کا گہرا مطالعہ کرے۔ اور مسلسل تجربات اور پیہم تگ و تاز سے خدا کے نظام و قوانینِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھتا چلا جائے۔

(۳) قوم مومنین کا یہی شعار ہے۔ گروہ متقین کا یہی فریضہ ہے۔ یہی خدا کا ذکر ہے۔ اس فکر سے چھپی ہوئی حقیقتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اور انسان کائنات کی ایک ایک شے کے متعلق علیٰ وجہ البصیرت کہہ سکتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا۔

قرآنی صداقت کی شہادت

اتنا ہی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے کہ خود قرآن کی صداقت کی شہادت بھی انہی کائناتی آیات سے ملتی ہے۔ سورہ حم سجدہ میں ہے سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ ہم انہیں اپنی آیات، عالم آفاق اور عالم انفس میں دکھائیں گے۔ تاآنکہ یہ بات ان کے سامنے ابھر کر آجائے کہ قرآن فی الواقعہ ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ یعنی زمانے کے پیچ و خم میں لپٹے ہوئے حقائق جوں جوں انسانی علم و کاوش کے ہاتھوں کھلتے جائیں گے قرآن کے دعاوی کے ثبوت ایک ایک کر کے سامنے آتے جائیں گے۔ جوں جوں زمانہ مشاہداتِ فطرت اور علوم سائنس میں آگے بڑھتا جائے گا۔ قرآنی حقائق بے نقاب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس آیت میں قرآن نے خارجی کائنات (آفاق) کے ساتھ خود انسانی دنیا (انفس) کو شامل کر کے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ سائنس کا تعلق صرف طبیعیات (PHYSICS) ہی سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے متعلق جس قدر علوم ہیں۔ وہ بھی اس کے دائرے کے اندر آجاتے ہیں۔ لیکن ان

علوم کے متعلق محض نظری بحثیں مطلوب نہیں بلکہ ان کی تحقیق بھی عملی مشاہدات اور تجارب کی رُو سے کی جائے گی تاریخ عمرانیات (SOCIALOGY) اور عملی سائیکولوجی کو اس باب میں خاص اہمیت حاصل ہو گی۔ طبعی سائنس اور انسانی زندگی سے متعلق علوم کی بڑھنے جوں جوں حقائق بے نقاب ہوتے جائیں گے۔ قرآن کی پیش کردہ صداقتوں کی دلیلیں سامنے آتی جائیں گی۔ یہ اس لئے کہ اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ قرآن اس خدا کی کتاب ہے جس کی نگاہوں سے کوئی راز مستور نہیں۔ اس کے سامنے کائنات کی ہر شے بے نقاب رکھی ہے۔ وہ ہر شے کا ہر وقت مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ اور یہ اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ ان اشیاء کے متعلق جو کچھ کہے گا ٹھیک ٹھیک کہے گا۔ اس کا بیان علم وحقیقت پر مبنی ہوگا۔ ظن وقیاس پر نہیں۔ اس لئے کہ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (۲۵/۶) قرآن اس خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے جو کائنات کے تمام رموز واسرار سے واقف ہے۔ لیکن جو لوگ کائنات کی ان آیات سے بے خبر رہتے ہیں۔ انھیں درحقیقت "لقاء رب" کا یقین نہیں ہوتا۔ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ۔ حالانکہ انھیں اس کے لئے کہیں دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ کسی شے کی بھی ریسرچ شروع کر دیں تو انھیں خدا کا قانونِ ربوبیت جھلمل جھلمل کرتا نظر آ جائے اس لئے کہ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ (۴۱/۵۴) خدا کا قانونِ ربوبیت ہر شے کو محیط ہے۔ کسی ایک چیز تک ہی وابستہ نہیں۔ اس لئے ؎

چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تمہیں یاد ہوگا سلیم! میں نے تم سے ایک دفعہ ایک بڑی عمدہ کتاب کا ذکر کیا تھا جس کا نام تھا (THE GREAT DESIGN) مجھے افسوس ہے کہ یہ کتاب مجھے اب یہاں کسی لائبریری میں نہیں ملی اور نہ ہی ولایت میں کسی کتب فروش سے دستیاب ہو سکی ہے ورنہ میں تمہیں پڑھنے کے لئے دیتا۔ اس کتاب کا پلان یہ تھا کہ دنیا کے مختلف علوم کے ائمہ فکر وتحقیق کے پاس یہ سوالنامہ بھیجا گیا کہ آپ نے اپنے شعبہ علم میں جس قدر تحقیق کی ہے۔ کیا اس کے بعد آپ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ یہ نظام کائنات کسی خاص نظم وضبط کے مطابق چل رہا ہے یا یونہی ہنگامی طور پر وجود میں آ گیا اور ہنگامی طور پر چلے جا رہا ہے؟ اس سوال کے جوابات ان بڑے بڑے سائنسدانوں کی طرف سے موصول ہوئے انھیں بلا تنقید وتبصرہ محولہ صدر کتاب میں یکجا جمع کر دیا گیا ہے۔ ان جوابات کا احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ ایک عالم نباتیات کے مقالہ کا عنوان تھا "ایک سبز پتہ" اور غالباً سر جیمز جینس نے ستاروں کی گذرگاہوں کے عنوان سے جواب لکھا تھا۔ ان میں ہر محقق اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ہمیں کائنات کے ذرے ذرے میں کسی علیم و حکیم قوت کے مستحکم اور غیر متبدل نظم وضبط کی کارفرمائیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کائناتی نظم وضبط کی یہی وہ کارفرمائیاں ہیں۔ جن کے سامنے ان ائمہ فکر وتحقیق کی نگاہِ عقیدت قدم قدم پر جھک جاتی ہے۔ لیکن چونکہ ان کے سامنے قرآن نہیں۔ اس لئے وہ اس حقیقت کے متعلق صحیح صحیح تصور کا اندازہ نہیں لگا سکتی جو اس نظام کو یہ حسن ورعنائی بخش رہی ہے۔ بایں ہمہ وہ اس کے نظام ربوبیت کبریٰ کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں۔ ان کے لئے اس مقام سے قرآن تک پہنچ جانا کچھ دشوار نہیں بشرطیکہ کوئی ان کے سامنے قرآن کو پیش کرنے والا ہو)

یہاں تک تم نے دیکھ لیا سلیم! کہ قرآن کی رو سے علم کی تعریف کیا ہے۔ اس کے بعد اس نقطہ کی وضاحت کی ضرورت ہی نہیں رہتی کہ قرآن کی رو سے عالم کسے کہتے ہیں اور علماء سے مراد کون لوگ ہیں۔ لیکن قرآن کریم کا اعجاز دیکھو کہ اس نے اس حقیقت کو بھی خود ہی واضح کر دیا ہے تاکہ اس باب میں کسی قسم کا شبہ یا ابہام نہ رہے۔ قرآن میں علماء کا لفظ صرف دو مقامات پر آیا ہے۔ ایک جگہ سورۃ شعراء میں (۲۶/۱۹۷) جہاں علمائے بنی اسرائیل کا ذکر ہے اور دوسری جگہ سورۃ فاطر میں جہاں خدا کے بندوں میں سے "علماء" کا ذکر ہے۔ اس تذکرہ کی ابتداء اس طرح ہوتی ہے اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا۔ کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ کا قانون کس طرح بادلوں سے مینہ برساتا ہے اور اس سے انواع و اقسام کے پھل پیدا ہوتے ہیں وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ اور پہاڑوں میں کس کس انداز کے سرخ و سفید طبقے ہیں، جن کے رنگ اور اقسام مختلف ہیں۔ اور ان میں بعض گہرے سیاہ رنگ کے ہیں۔ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ اور اسی طرح انسانوں اور دیگر جانداروں اور مویشیوں کے بھی مختلف اقسام ہیں۔ تم نے دیکھا سلیم! کہ ان آیات میں کن امور کا ذکر ہو رہا ہے۔ کائنات کے مختلف گوشوں کا۔ لہٰذا فطرت کے متنوع شعبوں کا۔ سائنس کے مختلف علوم کا۔ طبیعیات (PHYSICS) نباتات (BOTANY) طبقات الارض (GEOLOGY) حیوانیات ZOOLOGY اور انسانیات کے تمام شعبے اس کے اندر آجاتے ہیں۔ ان علوم و فنون کے تذکرہ کے بعد ہے اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے بندوں میں سے علماء ہی وہ ہیں جن کے دل پر اس کی عظمت اور ہیبت چھا جاتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (۳۵/۲۷-۲۸) کیونکہ وہ علیٰ وجہ البصیرت اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیتے ہیں کہ خدا کتنی بڑی قوتوں کا مالک ہے۔ اور کس طرح ایسے عظیم کارگہِ کائنات کو ہر قسم کی تخریب سے محفوظ رکھ کر آگے بڑھائے جا رہا ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ قرآن نے علماء کا لفظ کن لوگوں کے لئے استعمال کیا ہے؟ انہی کے لئے جنہیں ہم آج کی اصطلاح میں سائنٹسٹ اور کائناتی مفکر کہتے ہیں۔ وہ لوگ جو کائناتی نظام کا مطالعہ کرتے اور مسلسل مشاہدات و تجربات کے بعد فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ خدا نے فطرت کی تمام قوتیں ہمارے لئے مسخر کر رکھی ہیں (وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ) لیکن ان قوتوں کو اپنے کنٹرول میں وہی لا سکتا ہے جو ان قوانین سے واقف ہو جن کے مطابق یہ قوتیں کام کرتی ہیں۔ یہ قوانین، فطرت کے مشاہدہ اور مطالعہ اور پیہم تجربات سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ ان قوانین کا علم حاصل کرتے ہیں، انہیں قرآن علماء کہہ کر پکارتا ہے۔

علماء کون ہیں؟

ہمارے علماء

علماء کی اس قرآنی تعریف (DEFINITION) کے بعد تم غور کرو سلیم! کہ ہمارے ہاں جو حضرات علماء کہلاتے ہیں انہیں علم الفطرت (سائنس کے علوم) سے کس قدر تعلق ہوتا ہے؟ وہ علم الفطرت کے مبادیات تک سے واقف نہیں ہوتے۔ ان کا علم نظری مباحث۔ اور لفظی کتر بیونت سے ایک قدم آگے نہیں جاتا۔ اور یہ نظری مباحث بھی ان مسائل سے متعلق ہوتے ہیں، جنہیں نہ کائنات سے کچھ تعلق ہوتا ہے۔ نہ انسان کی عملی زندگی سے کچھ واسطہ۔ ہمارے مذہبی مدارس کا نصاب قریب دس سال

پر پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اس دس سال میں سے بیشتر عرصہ منطق، فلسفہ، معانی، بیان، ادب، نحو وغیرہ کی تحصیل میں صرف ہو جاتا ہے۔ اور منطق و فلسفہ بھی وہ جو اب عہدِ پارینہ کی داستان بن چکا ہے۔ اس نصاب میں ہیئت، ہندسہ اور حساب کی بھی دو تین کتابیں ہوتی ہیں۔ لیکن ان میں بھی وہ کچھ پڑھایا جاتا ہے جو زندگی میں کسی کام نہیں آتا۔ اور تو اور (تم حیران ہو گے کہ) ان کے نصاب میں قرآن کریم بھی داخل نہیں۔ تفسیر میں جلالین پڑھادی جاتی ہے۔ جس میں صرف قرآنی الفاظ کے مرادفات دیئے گئے ہیں۔ اور آخری سال سورۂ بقر کی تفسیر بیضاوی۔ بس یہ ہے ان کا نصاب جس کی تکمیل کے بعد انھیں عالم ہونے کی سند مل جاتی ہے۔ اشیائے فطرت کے متعلق ان حضرات کے علم کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ جب ہندوستان میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال شروع ہوا ہے۔ تو علمائے کرام سے اس کے جائز اور ناجائز ہونے کے متعلق فتوے مانگا گیا۔ اس فتوے کے جواب میں جمیعۃ العلماء کے صدر مفتی کفایت اللہ مرحوم نے لکھا کہ

> جس آلہ کے متعلق سوال کیا گیا وہ اب تک دیکھنے میں نہیں آیا۔ گر سننے میں آیا ہے کہ وہ ایک ایسا آلہ ہے جسے خطیب یا قاری کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور وہ اس کی طرف رخ کئے ہوئے قرأت یا خطاب کرتا ہے۔ پس وہ آلہ آواز کو جذب کر کے اتنی دور نشر کرتا ہے کہ اس کے چوتھائی فاصلہ تک بھی بغیر اس کی مدد کے آواز پہنچانا مشکل ہے۔ (بحوالہ نقیب ۱/۱۴ ۱۰)

اس کے بعد مفتی صاحب نے اس کے جواز کا فیصلہ دیدیا۔ لیکن دارالعلوم (دیوبند) کے ایک بہت بڑے مفتی صاحب نے (جو اب پاکستان میں قیام فرما ہیں) اس کے خلاف ان فتاوی کا مجموعہ شائع کیا۔ جس میں "عبادات مقصودہ" کے لئے اس آلہ کو حرام قرار دیا گیا تھا۔[1] انھوں نے اس رسالہ میں (جس کا نام البدائع المفیدۃ فی حکم الصنائع الجدیدہ تھا) لکھا تھا کہ انھیں معلوم نہیں تھا کہ اس آلہ کی ماہیت کیا ہے۔ اور وہ کس طرح کام کرتا ہے۔ اس کے لئے انھوں نے الیگزنڈرا ہائی اسکول بھوپال کے سائنس ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت فرمایا۔ انھوں نے کہا کہ

> برقی قوت کی وجہ سے میں تو کم از کم یہ ماننے میں تامل کرتا ہوں کہ اصل آواز آتی ہے۔ اور اس کا انکار بھی مجھ سے ممکن نہیں کہ ثبوت مشکل ہے۔

چنانچہ اس تحقیق انیق کے بعد مفتی صاحب نے عبادات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کے استعمال کو حرام قرار دیدیا۔ یعنی ماسٹر برج نندن صاحب کی بات کی بنیاد پر یہ فیصلہ فرمایا کہ خدا اور رسول کا اس باب میں یہ حکم ہے۔ تم نے غور کیا سلیم! کہ اشیائے فطرت کی تحقیقات اور علوم جدیدہ کے متعلق ان حضرات کی معلومات کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ ان چیزوں کے متعلق ان کی معلومات کا تو یہ عالم ہوتا ہے۔ لیکن یہ ان کے حرام و حلال ہونے کے متعلق فتوے صادر ضرور کرتے رہتے ہیں۔ اور اب پاکستان میں معاملہ فتاوی کی حد سے بڑھ کر

---

[1] اب یہی علمائے کرام لاؤڈ اسپیکر کو نماز اور خطبات میں بلا تکلف استعمال کرتے ہیں۔

قانون سازی تک پہنچ گیا ہے۔ مثلاً اگر اب یہ معاملہ حکومت کے سامنے آجائے کہ خطبات کے لئے لاؤڈ اسپیکر کا استعمال جائز ہے یا ناجائز۔ اور اس کے لئے کسی قانون کے وضع کرنے کی ضرورت ہو۔ تو یہ قانون حضرات علمائے کرام مرتب کریں گے۔ یعنی یہ حضرات پہلے (کسی) ماسٹر برج نندن لال صاحب سے دریافت کریں گے کہ لاؤڈ اسپیکر کا استعمال ہوتا کیا ہے۔ اور اس کی بہم پہنچائی ہوئی معلومات کی بنا پر اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ اس کا استعمال از روئے کتاب وسنت جائز ہے یا ناجائز۔ اور یہ فیصلہ مملکت کے قانون کی حیثیت سے ملک میں نافذ ہوگا۔ (چنانچہ یہی مفتی صاحب جن کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ آئین پاکستان کی تدوین کے سلسلہ میں مجلس آئین ساز کے شرعی مشیروں کے زمرہ میں شامل رہے ہیں) یہ حضرات سب سے زیادہ زور اس بات پر دیتے ہیں کہ اگر ہم نہ ہوں تو لوگوں کو شریعت کے مسائل کون بتائے۔ سو تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلامی مملکت میں شریعت کے مسائل اس مملکت کے قوانین سے الگ کچھ نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان کے بتانے کے لئے کسی خاص گروہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ یہ کام حکومت کے عمال کا ہوتا ہے نہ کہ مولویوں کے گروہ کا۔ جب رسول اللہؐ اور خلافت کے زمانہ میں اسلامی مملکت قائم تھی تو اس وقت مولویوں کی کوئی جماعت نہ تھی۔ یہ سب بعد کے زمانہ کی پیداوار ہیں۔

باقی رہے ایسے معاشرتی احکام جو روزمرہ کی زندگی میں پیش آتے ہیں۔ مثلاً نکاح کیسے پڑھانا چاہیئے۔ جنازہ کی نماز کس طرح ہوتی ہے تو ان تمام امور کا جاننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایسی باتیں نہیں جن کے لئے کسی دارالعلوم میں جانا پڑے یہ ہمارے عام مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔ اور اگر نہیں پڑھائی جاتیں تو پڑھائی جانی چاہئیں) اس لئے جو لوگ علوم سائنس کے ماہر ہوں گے وہ ان امور کو بھی جانتے ہوں گے۔ بہرحال اسلامی معاشرے میں اس قسم کی تمام باتیں عام مسلمانوں کو معلوم ہونی چاہئیں۔ لہٰذا ان کے لئے بھی کسی خاص گروہ کی ضرورت نہیں۔

ان تصریحات سے تم نے دیکھ لیا ہوگا سلیم! کہ قرآن کریم کی رو سے مومنین۔ متقین۔ خدا کا ذکر کرنے والے۔ لقاء رب کی آرزو اور یقین رکھنے والے وہی ہیں جو کائناتی نظام پر غور و فکر کرتے اور اشیائے فطرت کی تحقیقات (ریسرچ) کے لئے عملی جدوجہد کرتے ہیں۔ اسی کا نام قرآن کی رو سے علم ہے۔ اور اسی علم کے حاملین کو وہ علماء قرار دیتا ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اس مقام پر تمہارے دل میں یقیناً یہ خیال پیدا ہوگا کہ اس بنا پر تو یورپ کی قومیں صحیح معنوں میں مومن اور متقی ہیں۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں۔ جماعت مومنین اور گروہ متقین کے لئے علم الفطرت کی تحصیل نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ہر وہ قوم جو علم الفطرت حاصل کرلے۔ مومن اور متقی ہو جاتی ہے۔ یہ فرق اہم ہونے کے ساتھ ذرا باریک بھی ہے۔ اس لئے اسے غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ مومن و متقی وہ ہیں جو تسخیر فطرت کے بعد فطرت کی قوتوں کو ان قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرتے ہیں جو قرآن میں درج ہیں۔ مومن اور متقی ہونے کے لئے یہ دونوں شرطیں ناگزیر ہیں۔ یعنی (۱) تسخیر فطرت اور (۲) اس کے ماحصل کو قوانین خداوندی کے مطابق صرف کرنا۔ اگر کسی قوم میں ان دو شرطوں میں سے کسی ایک شرط کی

بھی کمی ہے تو وہ قوم مومن اور متقی نہیں ہو سکتی اُدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ([illegible]) کا حکم دیتا ہے۔ یعنی قرآن کے پورے کے پورے نظام کو اپنے اوپر وارد کرنے کا حکم۔ ہم صحیح معنوں میں مومن اور متقی نہیں۔ کیونکہ ہم میں شرطِ اول (تسخیرِ فطرت) کی کمی ہے (اور جب ہم شرطِ اول۔ تسخیرِ فطرت ہی پوری نہیں کرتے تو شرطِ دوم۔ قوائے فطرت کا قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) اور اقوامِ مغرب مومن اور متقی نہیں۔ کیونکہ ان میں شرطِ دوم کی کمی ہے۔ لہٰذا ایمان و تقویٰ کی سطح پر وہ اور ہم دونوں یکساں ہیں۔ لیکن وہ قومیں اس اعتبار سے ہم سے آگے ہیں کہ انھوں نے تسخیرِ فطرت سے اپنی طبعی زندگی کو خوشگوار بنا لیا ہے اور ہم روٹی تک کے لئے ان کے محتاج ہیں۔

قوائے فطرت کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لئے قرآن کے علم کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ قوانینِ خداوندی قرآن کے اندر ہیں۔ یہی وہ الراسخون فی العلم ([illegible]) ہیں جو قرآن پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان رکھتے ہیں۔ اور تمام امور کے فیصلے اسی کے مطابق کرتے ہیں کہ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ ([illegible]) جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ اس کفر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی معاشرہ دولت اور رزق کی فراوانی کے باوجود جہنم بن جاتا ہے (جیسا کہ اس وقت یورپ کا حال ہو رہا ہے) وہ لوگ سائنس کا اس قدر وسیع علم رکھنے کے باوجود، انسانی زندگی کے معاملات کا صحیح حل دریافت نہیں کر سکتے۔ یعنی اس باب میں ان کا سمع و بصر و فؤاد انھیں کچھ کام نہیں دے رہا۔ قرآن کریم نے ایسی ہی قوموں کے متعلق کہا ہے کہ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ إِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّأَبْصَارًا وَّأَفْئِدَةً ہم نے ان قوموں کو دنیا میں اس قدر تمکن عطا کیا تھا کہ تمھیں بھی ایسا تمکن نہیں عطا کیا۔ اس کے ساتھ ہی انھیں سمع و بصر و فؤاد بھی عطا کیا تھا لیکن فَمَا أَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ أَبْصَارُهُمْ وَلَآ أَفْئِدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ إِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِآيَاتِ اللّٰهِ ([illegible]) لیکن جب انھوں نے ان قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کیا جو رسولوں کی وساطت سے انھیں ملے تھے تو ان کی سمع و بصر و فؤاد انھیں تباہی سے نہ بچا سکے۔ یہ تمام علم ان کے کسی کام نہ آ سکا۔ اگر یہ لوگ کائنات کی قوتوں اور فطرت کی بخششوں کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کریں تو وہ جہنم جس میں دنیا اس وقت مبتلا ہے اس جنت میں تبدیل ہو جائے۔ جس کی تلاش میں انسانیت ماری ماری پھر رہی ہے۔ دیکھو سلیم! اس حقیقت کو قرآن کیسے حسین انداز میں بیان کرتا ہے۔ تم سورۂ یونس کی ان آیات کو پھر اپنے سامنے لاؤ جن میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کائنات میں غور و فکر سے خدا کے نظامِ ربوبیت کو اپنے سامنے بے نقاب نہیں دیکھنا چاہتے اور جو کچھ انھیں یونہی میسر آ جاتا ہے۔ اس پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں أُولٰئِكَ مَأْوَاهُمُ النَّارُ ([illegible]) یہ لوگ جہنم میں بستے ہیں۔ اس کے برعکس الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جو لوگ ان کے برعکس آیاتِ خداوندی پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اس کے بتلائے ہوئے صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوتے ہیں يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ بِإِيْمَانِهِمْ ان کا نشو و نما دینے والا ان کے اس ایمان کی بنا پر زندگی کے صحیح نقشوں کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتا ہے تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خوشگواریوں کے ان باغات میں بستے ہیں۔ جن کی شادابیں

میں کبھی فرق نہیں آتا۔ دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ اس جنتی معاشرہ کو دیکھ کر ان کے لب پر بے ساختہ یہ پکار آجاتی ہے کہ بارالٰہا! فی الواقعہ یہ بات تجھ سے بہت بعید تھی کہ تو اس کائنات کو باطل پیدا کر دیتا وَتَحِیَّتُھُمْ فِیْھَا سَلٰمٌ اور اس معاشرہ میں ان کی ایک دوسرے کے متعلق آرزوئیں بڑی ہی حیات بخش اور سلامتی افروز ہوتی ہیں۔ جن لوگوں نے اس معاشرہ کو قائم کیا وہ مسلسل جدوجہد اور پیہم سعی و عمل سے اس کی حدود کو وسیع سے وسیع تر کرتے جائیں گے۔ تا آنکہ آخر الامر یہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہو جائے گا۔ ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ خدا کا یہ نظامِ ربوبیت کس طرح ہر قسم کی حمد و ستائش کا سزاوار ہے وَاٰخِرُ دَعْوٰھُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (۱۰/۱۰) یہ نتیجہ ہوتا ہے فطرت کی نعمتوں کو خدا کے قانون کے مطابق صرف اور تقسیم کرنے کا۔

حرفِ آخر

ان تصریحات سے یہ حقیقت تمہارے سامنے آگئی ہوگی سلیم! کہ اگر ہم اپنے معاشرہ کو قرآنی خطوط پر تشکل کرنا چاہیں تو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ہم اس قسم کے ریسرچ سکالرز اور سائنسدان (SCIENTISTS) پیدا کریں جو انفس و آفاق کے ہر شعبے میں قوانینِ فطرت کے مشاہدات و تجربات سے، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتے جائیں۔ اور اس کے ساتھ وہ قوانینِ خداوندی جو قرآن کے اندر محفوظ ہیں اس طرح عام کئے جائیں کہ فطرت کی ان قوتوں کو ان قوانین کے مطابق تقسیم اور استعمال کرنے میں کوئی دقت نہ ہو۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھیں قرآن کی رُو سے علما کہا جائے گا جب تک علم اور علماء کے متعلق ہمارا موجودہ تصور نہیں بدلتا۔ خدا تک پہنچنا تو ایک طرف، ہم زندہ قوموں کے زمرے میں بھی شامل نہیں ہو سکتے۔ وفیہا آیات لقوم یعقلون۔

"نظامِ ربوبیت"

از پرویز

انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل۔ اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور۔ دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ ضخامت تین سو صفحے

قیمت قسم اول مجلد چھ روپے۔ قیمت قسم دوم غیر مجلد چار روپے

نوادرات

از:- علامہ اسلم جیراجپوری

علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ

قیمت:- چار روپے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام کراچی

مجلسِ اقبال*

بابِ نہم. در شرحِ اسمائے حضرت علی مرتضیٰؓ (سلسل)

سابقہ شعر میں حضرت علامہ نے کہا تھا کہ

با جہانِ نامساعد ساختن
ہست در میداں سپر انداختن

دنیا میں دو قسم کی روشیں ہوسکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اگر زمانہ کی روش تمہاری روش کے خلاف ہے تو تم اپنی روش کو بدل کر زمانے کے مطابق کرلو۔ زمانے میں اگر جھوٹ۔ بددیانتی۔ مکر و فریب عام ہو رہا ہے اور تم دیکھتے ہو کہ دیانتداری اور اصول پرستی سے نقصان ہوتا ہے تو تم بھی بددیانتی کا شیوہ اختیار کرلو۔ یہ تھی وہ "اخلاقی تعلیم" جو ہمارے دورِ ملوکیت و استبداد میں پیدا ہوئی۔ یعنی

زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ بساز

لیکن دوسری روش یہ ہے کہ تم ہمیشہ اپنے اصول پر پختگی سے قائم رہو۔ زمانہ اگر تمہارے اصول کے خلاف چلتا ہے تو تم زمانے کے دھارے کا رخ موڑنے کی کوشش کرو۔ اس کے خلاف مسلسل جہاد کرو۔ نقصان اٹھاؤ۔ تکلیفیں برداشت کرو۔ لیکن اپنے صحیح اور سچے اصول کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دو۔ یعنی

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

کی روش۔ علامہ اقبال نے کہا ہے کہ حدیثِ بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز۔ جو اس قسم کی تعلیم دیتے ہیں، وہ حق و صداقت کی آل پرستانہ روش سے بے خبر ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک مردِ آزاد کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ ایک مردِ آزاد کے لئے اپنی روش کو چھوڑ کر زمانے کے ساتھ چل دینا، انتہائی شکست ہے۔ حق و باطل کے مقابلہ میں ہار مان لینا ہے۔ مصائبِ زندگی میں سپر انداختن ہے۔ اس کے مقابلہ میں

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاجِ او بسازد روزگار

وہ مرد مومن جس کی خودی مستحکم ہو اور وہ اپنے ارادہ کا پکا اور اصول پرستی میں پختہ ہو۔ زمانہ کو اس کے ساتھ سازگار وموافق ہونا پڑتا ہے۔

گر نسازد با مزاجِ او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں

اگر زمانہ اس کی اصول پرستی کے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو وہ ہتھیار نہیں ڈال دیتا بلکہ اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہے اور مسلسل جہاد جاری رکھتا ہے۔ اور اس طرح

برکند بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیبِ نو ذرات را

وہ زمانے کی غلط چیزوں کو، جو اس کے سامنے ہوتی ہیں، جڑ بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کے پروگرام کا یہ حصہ تخریبی ہوتا ہے لیکن وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ وہ اپنے سامنے تعمیری پروگرام بھی رکھتا ہے۔ تخریبی پروگرام تو فقط لاالٰہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب تک الا اللہ نہ ہو اس پروگرام کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ مردِ مومن ہر غلط عمارت کی بنیادوں کو برباد کر کے اس کے ذرات کو ایک نئی ترکیب دیتا ہے۔

گردشِ ایام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند

وہ زمانے کی گردش کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ وہ فلکِ ناہنجار کی کجروی کو الٹ کر رکھ دیتا ہے اور اس کے بعد

می کند از قوتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد سازگار

اپنی قوت وہ دوں سے ایک ایسی دنیا کی تخلیق کرتا ہے۔ جو اس کی اصول پرستی کی محکم روش کے مطابق چلتی ہے۔ یہ ہے ایک مرد مومن کے جہادِ مسلسل کا نتیجہ۔ ہر اس نظام کو تباہ کر کے جس کا نتیجہ ظہر الفساد فی البر والبحر ہو۔ جس میں کوئی شے اپنے اصل مقام پر نہ رہ سکتی ہو۔ ایک ایسے نظام کو متشکل کرنا جس میں "زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے"۔ دنیا میں ہر نبی اسی قسم کا انقلاب پیدا کرنے کے لئے آتا رہا۔ اور اب حضور خاتم النبیینؐ کے بعد، یہی فریضہ آپ کی امت کا ہے۔ ایک مرد مومن کا شعار ہی یہ ہے وہ زمانے کی ہر غلط روش کے خلاف نبرد آزما ہوتا ہے۔ پھر یا تو اس روش کو بدل کر اسے صراطِ مستقیم کے ساتھ ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ اور یا اس سعیٔ پیہم میں اپنی جان دیدیتا ہے۔

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست
ہم چو مرداں جاں سپردن زندگیست

قرآن کے الفاظ میں یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱) وہ نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے نبرد

آزما ہوتے ہیں۔ پھر یا تو دشمن کو شکست دے کر غالب آجاتے ہیں اور یا میدانِ جنگ میں جان دیتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اس رمز سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ

ہے کبھی جاں ۔ اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی

کبھی تو زندہ رہنے کا نام زندگی ہوتا ہے اور کبھی ایسا وقت بھی آجاتا ہے کہ زندگی جان دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جس کے متعلق قرآن میں ہے کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ (۲/۱۵۴) جو خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ مت کہو۔ وہ زندہ ہیں۔ لیکن تم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اس حقیقت کا احساس نہیں کرسکتے کہ وہ کس طرح زندہ ہیں۔ انہیں وہ زندگی نصیب ہوتی ہے جس میں موت کا گذر نہیں ہوتا۔ بہرحال یہ ہے ایک مردِ مومن کا اندازِ زیست کہ وہ ناساعدت حالات سے ٹکراتا ہے اور اس ٹکراؤ سے اسے پتہ چلتا رہتا ہے کہ اس کی مضمر قوتیں کس حد تک نشوونما پا چکی ہیں۔ اس کی خودی کس حد تک بیدار ہو چکی ہے۔ یہ تصادم و تزاحم کہ جسے عام طور پر ابتلاء و آزمائش کہا جاتا ہے۔ درحقیقت انسان کے جوہرِ خودی کی نمود کے مواقع ہوتے ہیں۔ قرآن نے ابتلاء (بلاء) کا لفظ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ ہم ناساعد حالات۔ یعنی خوف۔ بھوک۔ مال و جان اور کھیتی باڑی کے نقصانات سے ایسے مواقع بہم پہنچائیں گے۔ جن سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آجائے کہ تم میں کس قدر استقامت آچکی ہے (وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۲/۱۵۵) یہی وہ ناساعد حالات ہیں جن کے ساتھ تصادم سے ایک مردِ مومن اپنی خودی کے استحکام کو پرکھتا رہتا ہے۔

آزماید صاحبِ قلبِ سلیم
زورِ خود را از مہماتِ عظیم

جتنا سخت مقابلہ ہوگا اتنا ہی زیادہ جوہرِ خودی کی نمود کا موقع ہوگا۔ اسی لئے کہا ہے کہ

عشق با دشوار ورزیدن خوش است
چوں خلیل از شعلہ گل چیدن خوش است

عشق بہت مشکل پسند واقع ہوا ہے۔ وہ کوہ کنی اور خارا شگافی کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ حضرت خلیل اکبر کی طرح بے خطر آتشِ نمرود میں کود کر اس قسم کی ناساعد فضا کو اپنے لئے گلزار بنا لیتا ہے۔ حضرت ابراہیم کے تذکرۂ جلیلہ کے ضمن میں بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ (۲/۱۲۴) جب تیرے نشوونما دینے والے نے ابراہیم کو نمودِ ذات کے مواقع بہم پہنچائے تو وہ نہایت ثبات و دوام سے ان میں پورا اترا اور اس طرح اس نے بتا دیا کہ اس کی تکمیلِ ذات میں کوئی کمی نہیں رہی۔ اس کے بعد خدا نے اس سے کہا کہ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا (۲/۱۲۴) اب تو نوعِ انسانی کی امامت کا سزاوار ہو گیا ہے۔ اب تو اس قابل ہو گیا ہے کہ انسانیت حرمِ زندگی کی دیواریں تجھے دیکھ کر سیدھی کرے۔ یہ سب اس لئے کہ تم نے سخت ترین تصادمات

سے اپنی خودی کے استحکام کا ثبوت دیدیا۔ یہی نمو خودی کا ذریعہ ہے۔

ممکناتِ قوتِ مردان کار
گردد از مشکل پسندی آشکار

کام کرنے والے لوگ، کبھی مکر و فریب سے کام نہیں لیتے۔ وہ کبھی کمینے حربے استعمال نہیں کرتے۔ وہ مخالفت کا مقابلہ کھلے بندوں کرتے ہیں۔ اور للکار کر کرتے ہیں چھپے ہوئے کینے اور نقاب پوش عداوتیں، بزدلوں کے حربے ہیں۔

حربۂ دوں ہمتاں کین است و بس
زندگی را این یک آئین است و بس

اس کے برعکس

زندگانی قوتِ پیداستے
اصلِ او از ذوقِ استیلاستے

زندگی تو نام ہی ایسی قوت کا ہے جو آشکارا ہو کر سب کے سامنے آجائے۔ باطل پر غلبہ پانا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ کمزور آدمی باطل کے سامنے جھک جاتا ہے۔ اور اس کا نام حسنِ تسلیم و انکساری رکھ لیتا ہے۔ وہ مقابلے سے جی چراتا ہے۔ اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو اور دوسروں کو فریب دیتا ہے کہ میں کسی سے بدلہ لینا نہیں چاہتا۔ حالانکہ

عفوِ بے جا سردیٔ خونِ حیات
سکتۂ در بیتِ موزونِ حیات

یہ ٹھیک ہے کہ عفو بھی ایک جوہر ہے۔ لیکن عفو کے معنی یہ ہیں کہ دشمن پر پورا پورا غلبہ پا لینے کے بعد جب دیکھا جائے کہ اب وہ سرکشی پر نادم ہے۔ اور آئندہ کے لئے صحیح روش اختیار کرنے پر مائل تو اسے معاف کر دیا جائے۔ جیسا کہ نبی اکرمؐ نے فتح مکہ کے بعد قریش مکہ سے کہا تھا کہ لَا تَثْرِیْبَ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ۔ یہ ہے عفو کا صحیح مفہوم۔ اس کے خلاف (جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے) مقابلے سے جی چرانا۔ اور اس کا نام صلح پسندی اور امن جوئی رکھ لینا خود فریبی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تمہاری رگوں میں خون منجمد ہو چکا ہے اس میں گرم جوشی باقی نہیں رہی۔ اس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باطل کی قوتیں بے لگام ہو کر ہر طرف فساد برپا کر دیتی ہیں۔ مسلک خانقاہیت (التصوف) دنیا میں یہی کچھ کرتا ہے۔ اس سے نظامِ کائنات کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ زندگی کے مصرعۂ موزوں میں اس سے سکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا وزن قائم نہیں رہتا۔ اسی کو فساد کہتے ہیں۔ قرآن نے جو کہا ہے کہ بعثتِ نبی اکرمؐ کے وقت، انسانی زندگی کے ہر گوشہ میں فساد ہی فساد رونما ہو چکا تھا تو اس سے یہی مفہوم تھا اور یہ لازمی نتیجہ تھا عیسائیت کے مسلکِ خانقاہیت کا جو کسی نہ کسی رنگ سے تمام دنیا کے مذاہب کو متاثر کر چکا تھا۔ یہی وہ مسلک ہے جس میں ہوتا ہے کہ

ہر کہ در قعرِ مذلت ماندہ است
ناتوانی را قناعت خواندہ است

کمزوری اور ناتوانی کا نام قناعت رکھ لیا جاتا ہے۔ بیکسی اور بے بسی کو منکسر المزاجی قرار دیدیا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لئے ہوتا ہے کہ انسان ذلت کے گڑھے میں گر کر وہاں سے نکلنا نہیں چاہتا۔ ورنہ کسے معلوم نہیں کہ

ناتوانی زندگی را رہزن است
بطنش از خوف و دروغ آبستن است

ضعف و ناتوانی زندگی کی متاع کے لئے رہزن ہے۔ خوف اور دروغ وہ تانا بانا ہے جس سے اس کا وجود قائم ہوتا ہے بلکہ یہ سانپ کے بچے پیدا ہی اسی کے بطن سے ہوتے ہیں۔ کمزور ہر ایک سے ڈرتا ہے اور قدم قدم پر جھوٹ بولتا ہے۔

از مکارم اندرونِ او تہی است
شیرش از بہر ذمائم فربہی است

ضعف و ناتوانی سے کوئی ایسا جوہر پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو انسان کے لئے وجہ شرف و تکریم ہو۔ اس کے دودھ سے عیوب اور ذمائم فربہ ہوتے ہیں۔ کمینہ خصلتیں اس سے پیدا ہوتی اور اس کے بل بوتے پر پروان چڑھتی ہیں۔

ہوشیار اے صاحب عقل سلیم
در کمینہا می نشیند ایں غنیم

اس سے احتیاط کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ غارت گر دین و دانش ہر وقت گھات میں رہتی ہے ——————
گھات میں، اس لئے کہ یہ کبھی بے نقاب ہو کر سامنے نہیں آتی بلکہ ہمیشہ زہد و اتقاء، خدا ترسی اور رحمدلی۔ حلم و انکساری کے لباس میں وجہ فریب نظر ہوتی ہے۔ ان باتوں کو مقربین بارگاہ خداوندی کی صفات جمیلہ قرار دیدیا جاتا ہے۔ اور اس طرح یہ زہر قاتل عین تریاق بن کر دکھائی دیتی ہے۔ لہذا،

گر خبردمندی! فریب او مخور
مثل حربا ہر زماں رنگش دگر

لیکن اس کے فریب سے بچنے کے لئے بڑی تیز نگاہوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے کہ یہ گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی رہتی ہے اور عوام تو عوام بڑے بڑے صاحب نظر بھی اس کے دھوکہ میں آجاتے ہیں۔

شکلِ او اہلِ نظر نشناختند
پردہ ہا بر روئے او انداختند

اسلام کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کتنے بڑے بڑے صاحب نظر ہیں جو اس کے فریب خوردہ دکھائی دیتے ہیں۔ اس لئے کہ افلاطونی علم نے اس پر اس قدر حسین و دبیز پردے ڈال رکھے ہیں کہ نگاہیں انہیں چیر کر اصل حقیقت تک پہنچ ہی نہیں سکتیں تصوف انہی حسین و دبیز پردوں ہی کا تو نام ہے۔

گاہ او را رحم و نرمی پردہ دار
گاہ می پوشد ردائے انکسار

رحم اور نرمی۔ انکساری اور خاکساری۔ سب کمزوری اور ناتوانی کے مظاہر ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ دنیائے روحانیت میں ان کا مقام کس قدر بلند دکھایا جاتا ہے۔

گاہ او مستور در مجبوری است
گاہ پنہاں در تہ معذوری است

کبھی اس کے لئے جبر کا عقیدہ وضع کیا جاتا ہے۔ اور انسان اپنے آپ کو یہ کہہ کر فریب دے لیتا ہے کہ جب کائنات کا ایک پتہ بھی خدا کے حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا تو شر کی یہ قوتیں کس طرح از خود فساد انگیز ہو سکتی ہیں۔ یہ سب خدا کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس لئے ان کی مخالفت کرنا مشیتِ خداوندی کے راستے میں روک بننا ہے۔ اگر کبھی ایسے لوگوں کو اس کا قائل بھی کرا دیا جائے کہ نوعِ انسانی کو تباہی سے بچانے کے لئے سانپوں کا مارنا ضروری ہے تو ان کا "گھڑا گھڑایا" عذر سامنے ہوتا ہے کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ہم اپنی وسعت اور استطاعت کی حد تک ہی مکلف ہیں۔ اس سے زیادہ کا خدا ہم سے مطالبہ ہی نہیں کرتا۔ لہٰذا شر کی اتنی اتنی بڑی قوتوں کی روک تھام ہمارے بس کی بات نہیں۔ لیکن یہ سب۔ انسان کی تن آسانی کے حیلے ہیں۔ جن سے بڑے بڑے صاحب قوت دل چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

چہرہ در شکل تن آسانی نمود
دل ز دستِ صاحبِ قوت ربود

یاد رکھئے

با توانائی صداقت توام است
گر خود آگاہی ہمیں جامِ جم است

صداقت (TRUTH) اور توانائی (POWER) دونوں توام (TWINS) ہیں۔ اگر کوئی صاحبِ قوت نہیں تو سمجھ لیجئے کہ وہ صداقت کا علمبردار نہیں۔ کمزور و ناتواں رہنا اور دعوے یہ کرنا کہ ہم حق و صداقت کے علمبردار ہیں۔ بالکل جھوٹ ہے۔ خود فریبی ہے۔ خود فراموشی ہے۔ اس حقیقت کو ہمیشہ سامنے رکھنا چاہیئے کہ

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرحِ رمزِ حق و باطل قوت است

انسان کی زندگی ایک کھیتی ہے۔ جس کی فصل (حاصل) قوت ہے۔ اگر زندگی میں قوت نہیں تو سمجھ لیجئے کہ اس کھیت میں کچھ پیدا ہی نہیں ہوا۔ ساری محنت رائیگاں گئی۔ اس کا ماحصل قوت تھی۔ اور قوت ہی حق و باطل کی کشمکش میں فیصلہ کن وا ہے۔ اگر حق کے ساتھ

قوت نہیں تو حق غالب نہیں آسکتا۔

مدعی گر مایہ دار از قوت است
دعوئے او بے نیاز از حجت است

اگر کوئی شخص کسی چیز کا دعوے یا مطالبہ (demand) کرتا ہے اور اس کے پاس قوت ہے تو پھر اسے اپنے دعوے کے اثبات کے لئے کسی دلیل اور سند کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اس کی قوت خود اس کے دعوے کے مبنی برحق ہونے کی دلیل بن جاتی ہے۔

باطل از قوت پذیرد شان حق
خویش را حق داند از بطلان حق

اگر باطل صاحب قوت ہے تو وہ دنیا کے سامنے حق بن کر آتا ہے اور دنیا سے اپنے اس دعوے کو تسلیم کرالیتا ہے۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ باطل قوت کے زور پر حق بن نہیں سکتا۔ لیکن وہ حق ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ اور چونکہ اس کے پاس قوت ہوتی ہے اس لئے دنیا اس کے اس دعوے کو تسلیم کر لیتی ہے۔ اس طرح وہ حق کو باطل قرار دے کر خود حق بن کر بیٹھ جاتا ہے۔ انسانیت کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ باطل نے کس طرح قوت کے زور پر اپنے آپ کو حق کہہ کر منوالیا۔ اور دنیا پر اپنا سکہ جمایا۔ یہی کچھ ہوتا آیا ہے اور یہی کچھ آج بھی ہو رہا ہے۔ آپ دیکھئے کہ مفاد پرست گروہ اپنی تنظیم اور پروپیگنڈے کے زور پر کس طرح حق و صداقت کے علمبردار بن جاتے ہیں۔ اور پھر ہوتا یہ ہے کہ

از کن او زهر کوثر می شود
خیر را گوید شرے، شر می شود

وہ زہر سے کہدیتا ہے کہ کوثر بن جا تو وہ کوثر بن کر دکھائی دیتا ہے۔ وہ خیر کے متعلق کہہ دیتا ہے کہ یہ شر ہے تو لوگ اسے شر کہنے لگ جاتے ہیں۔ قوت دنیا میں یہ کچھ کرتی ہے۔

اس حقیقت کشائیہ کے بعد حضرت علامہ مسلمان سے کہتے ہیں کہ

اے ز آداب امانت بے خبر	از دو عالم خویش را بہتر شمر
از رموز زندگی آگاہ شو	ظالم و جاہل ز غیر اللہ شو

"امانت" اور "ظالم و جاہل" سے قرآن کریم کی اس آیت کی طرف تلمیح ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ ۖ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۔ (۳۳)

اس کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ

ہم نے امانت کو آسمانوں پر۔ زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا تو وہ اس سے ڈر گئے۔ اور اس لئے انہوں نے اس بوجھ

کے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ لیکن انسان نے اس بوجھ کو اٹھا لیا۔ وہ بے شک بڑا ہی ظالم اور جاہل ہے۔

یہ ترجمہ بوجوہ غلط ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر یہ مذکور ہے کہ زمین و آسمان اور کائنات کی ہر شے قوانین خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ ان میں سے کوئی بھی اسکی اطاعت سے مجالِ سرتابی نہیں رکھتی۔ قرآن کی اس صراحت کی موجودگی میں یہ سمجھنا کہ اللہ نے زمین و آسمان کے سامنے اپنی کسی امانت کو پیش کیا تو انہوں نے اسکے اٹھانے سے انکار کر دیا۔ کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد یہ کہ جس امانت خداوندی کے اٹھانے سے ارض و سما نے انکار کر دیا اسے اٹھانے کے لئے اگر انسان نے اپنے آپ کو پیش کر دیا تو اس کا یہ عمل تعریف و ستائش کا موجب ہونا چاہیئے تھا نہ کہ ظالم و جاہل قرار پانے کا مستحق۔ قرآن کی اس آیۂ جلیلہ کے صحیح طور پر نہ سمجھے جانے کی وجہ "حمل امانت" کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونا ہے۔ حمل امانت کے معنی امانت کا اٹھانا نہیں بلکہ امانت میں خیانت کرنا ہے لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے جب آفاقی کائنات سے کہا کہ وہ اس کے قانون (مشیت کے پروگرام) کے مطابق زندگی بسر کرے تو اسکی اس نے حرفاً حرفاً تعمیل کی۔ اس امانت میں ذرا بھی خیانت نہ کی۔ اسلئے کائنات اس خیانت کے انجام و عواقب سے ڈر گئیں۔ لیکن انسان اسمیں خیانت کرتا ہے اور نہیں سمجھتا کہ اس سے وہ کسی اور کا کچھ نہیں بگاڑتا۔ خود اپنے خلاف زیادتی کرتا ہے علامہ اقبال انسان (اور اس کے بعد مسلمان) سے کہتے ہیں کہ تو تو اشرف المخلوقات ہے۔ تجھے اپنے آپ کو تمام کائنات سے بہتر سمجھنا چاہیئے اسلئے جس مذموم حرکت (خیانت) کو کائنات نے پسند نہیں کیا تو وہ تجھ سے سرزد نہیں ہونی چاہیئے۔ اگر تجھے سرکش (ظالم) اور جاہل (غافل) ہونا ہے تو یہ چیزیں غیر خداوندی قوانین کے خلاف ہونی چاہئیں۔ تجھے ان سے غفلت برتنی چاہیئے اور ان کے خلاف سرکشی اختیار کرنی چاہیئے۔ اور غیر خداوندی قانون یہ ہے کہ ضعف و ناتوانی میں قربِ الٰہی اور روحانیت کے ارتقاء کا راز پوشیدہ سمجھا جائے۔ یکسر غلط ہے۔ تمہیں اس حق نما باطل سے سرکشی اختیار کرنی چاہیئے۔ تصوف تمہیں یہ سکھاتا ہے کہ "چشم بند و گوش بند و لب ببند" لیکن تم اس کے برعکس یہ کرو کہ

چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہِ حق بر من بخند

اپنی آنکھیں، کان اور لب کھلے رکھو۔ اپنی سماعت و بصارت اور قلب سلیم سے کام لو۔ کائنات کی ہر شے کا بغور مشاہدہ کرو۔ کتاب فطرت کے ہر ورق کا باسعانِ نظر مطالعہ کرو۔ اس طرح تم ان قوانین سے واقف ہو جاؤ گے جن کے مطابق اشیائے فطرت اپنا اپنا وظیفہ سرانجام دے رہی ہیں۔ جب تم نے ان قوانین کا علم حاصل کر لیا تو سمجھو کہ تم نے انہیں مسخر کر لیا۔ اس میں تمہاری قوت کا راز پنہاں ہے اور قوت کے بغیر زندگی بے معنی اور حق بلا نتیجہ رہتا ہے۔ ملائکہ نے آدم کے سامنے سجدہ اسی وقت کیا تھا جب اسے اشیائے کائنات کا علم دیا گیا تھا (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا)، اس کا مطلب یہی ہے کہ تسخیر کائنات علم الفطرت کی رو سے ہو سکتی ہے۔ تصوف کا فیصلہ یہ ہے کہ حواس (سمع و بصر) کے ذریعے سے حاصل کردہ علم یکسر قیاس اور فریب ہوتا ہے۔ حقیقی علم وہ ہے جسے انسان کان اور آنکھیں بند کر کے عالم تصور میں حاصل کرے۔ اس سے انسان تسخیر فطرت سے محروم رہ جاتا ہے یہ ہے وہ فریب جس سے انسان اپنی مضمر قوتوں سے بے بہرہ ہو کر دنیا میں ذلیل و خوار ہو جاتا ہے (۱)۔ نکتہ کی مزید تفصیل کے لئے "سلیم کے نام خط" دیکھئے جو اسی پرچے میں شائع ہو رہا ہے)

اس شعر پر باب ہنم کی زیرِ نظر فصل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

سلسلۂ اصلاح و تذکیر (محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

— ۵ —

(اس مضمون کی گذشتہ چار اقساط میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اور اس سلسلہ میں اولاد اور والدین کے کیا فرائض و واجبات ہیں۔ مضمون کی حالیہ قسط میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ بہن بھائیوں کے باہمی تعلقات کس قسم کے ہونے چاہئیں اور ان کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟)

بھائی بہنیں

قرآنی معاشرہ میں بھائیوں اور بہنوں کے تعلقات کس قسم کے ہونے چاہئیں۔ اس کو سمجھنے کے لئے ہمیں پہلے ان الفاظ کے بنیادی معنوں پر غور کر لینا چاہیئے۔ جو قرآن کریم نے اس تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ بنیادی معنی سمجھ میں آجانے کے بعد اس تعلق کی واضح تصویر سامنے آجاتی ہے۔ جو قرآن اس سلسلہ میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

عربی زبان میں بھائی کو اَخٌ اور بہن کو اُختٌ کہتے ہیں۔ یہ دونوں لفظ اخیۃ اور آخِیۃ یا "اَخِیّۃٌ" اور اَخِیَۃٌ سے نکلے ہیں۔ عربی زبان میں اخِیّۃٌ اور آخِیَۃٌ اس لکڑی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے دیوار کے اندر چُنے ہوئے ہوں اور درمیانی حصہ جانوروں کو باندھنے کے لئے کھلا ہوا ہو۔ یا اس رسّی کو کہتے ہیں جس کے دونوں کنارے زمین میں مٹی کے نیچے دبے ہوئے ہوں۔ اور اس کا درمیانی حصہ ایک حلقہ کی صورت میں زمین پر ابھرا ہوا ہو۔ تاکہ اس کے ساتھ گھوڑوں اور دیگر جانوروں کو باندھا جا سکے اَخٌ اور اُختٌ اسی اِخِیّۃٌ اور اَخِیَۃٌ سے نکلے ہیں۔ (محیط المحیط صـ۱۲ ـ ج ۱) یہ ہے اَخِیّتٌ (بھائی چارگی) کی بنیادی تصویر کہ لکڑی یا رسی کے دونوں کنارے اپنی اپنی انفرادیت (INDIVIDUALITY) رکھتے ہیں مگر وہ دیوار کے اندر چُنے ہوتے یا زمین

کے نیچے دبے ہوئے ہوتے ہیں۔ مشاہدہ میں جو چیز آتی ہے، وہ ان کا درمیانی حصہ ہوتا ہے، جو خود ایک وحدت ہوتا ہے یعنی دو ہوتے ہوئے بھی ایک وجہ کہ دوئی غیر مشہود (INVISIBLE) اور وحدت مشہود (VISIBLE) ہوتی ہے۔ بھائی بھائی، اپنی اپنی شخصیت اور انفرادیت تو رکھتے ہیں۔ مگر ان کی یہ انفرادیت اور شخصیت غیر مشہود سی ہونی چاہیئے۔ اور وہ دونوں اس درجہ متحد العمل اور متحد الخیال ہوں کہ دونوں ایک ہی وحدت معلوم ہوتے ہوں۔ ابن عرفہ نے کہا ہے کہ اُخُوَّۃ کے معنی بھائی بھائی ہونے کے علاوہ ہم شکلی اور عملی ہم آہنگی کے بھی ہوتے ہیں۔ (تاج العروس ص۱ ج ۱۰) قرآن کریم نے اِخْوَانٌ (اَخٌ کی جمع ہے) کا لفظ اَعْدَآءٌ کے مقابلہ میں استعمال کر کے اَخٌ کے معنی کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے۔

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ
فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا (۳/۱۰۳)

اَعْدَآءٌ انہیں کہتے ہیں جن کے درمیان میں پچر (WEDGE) لگ رہی ہو لہٰذا اَعْدَآءٌ کے مقابلہ میں اِخْوَانٌ وہ ہوں گے، جن کے درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ جن کے دل آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مل چکے ہیں جیسے بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے سے گھل مل جاتا ہے (فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ) بادل کے دو ٹکڑے اپنی اپنی انفرادیت رکھتے تھے مگر وہ اپنی انفرادیت کو کھو کر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ خود ایک وحدت بن جاتے ہیں۔ اب تو جو چیز نظر آتی ہے وہ ایک وحدت ہی نظر آتی ہے۔ اور دونوں ٹکڑوں کی انفرادیت بالکل گم ہو جاتی ہے۔ ان کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی بعض علمائے نحو کا خیال ہے کہ بھائی کو اَخٌ اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا ارادہ اور آہنگ بعینہٖ وہی کچھ ہوتا ہے جو دوسرے بھائی کا ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ یہ وخی سے نکلا ہے۔ جس کے معنے ارادہ کرنے کے ہوتے ہیں۔ اَخٌ میں وخی کا واو ہمزہ کے ساتھ بدل گیا ہے اس سے معلوم ہو گیا کہ بھائی کو اَخٌ اس لئے بھی کہتے ہیں کہ دونوں ہم مقصد ہوتے ہیں۔ یعنی ایک کا ارادہ بعینہٖ وہی کچھ ہوتا ہے جو دوسرے کا ہوتا ہے۔ ایک کی مرضی دوسرے کی مرضی میں گم ہو جاتی ہے۔

قرآن کریم تمام مومنین کو اِخْوَۃٌ کہتا ہے (اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ ۴۹/۱۰) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مومنین کا معاشرہ کن بنیادوں پر قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس موضوع پر ہم آئندہ روشنی ڈالیں گے۔ مگر سردست یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ بھائیوں اور بہنوں کے تعلقات آپس میں کس قسم کے ہونے چاہئیں۔

تصریحات بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی لغت کے اعتبار سے بھائی بہن (اَخٌ اور اُخْتٌ) ان کو کہتے ہیں جو اگرچہ اپنے اپنے طور پر الگ الگ اپنی اپنی انفرادیت رکھتے ہیں مگر ان کی یہ انفرادیت غیر مشہود سی ہوتی ہے۔ مشہود طور پر جب وہ سامنے آتے ہیں تو شکل و صورت، دل و دماغ، عمل اور مقصد میں وہ اس طرح پر گھلے ملے ہوتے ہیں کہ ایک ہی وحدت نظر آتے ہیں جیسے بادل کے دو ٹکڑے آپس میں گھل مل کر ایک ذات ہو جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذرا اس نکتہ پر بھی غور کیجئے کہ اس اُخُوَّت کا وجود اسی وقت تک برقرار ہے۔ جب تک لکڑی یا رسی کے دونوں کنارے اپنی پوری توانائی اس حلقہ کو باقی رکھنے پر صرف کرتے رہیں۔ جونہی

ان میں سے ایک پر خود نمائی کا شوق سوار ہوا۔ اور وہ دیوار یا زمین سے باہر نکل آیا تو یہ حلقہ ختم ہو گیا۔ بعینہٖ یہی حال اُخُوَّت کا بھی ہے۔ بھائی بھائی اسی وقت تک بھائی بھائی ہیں جب تک وہ مشترکہ مقصد کے لئے اپنی پوری توانائیاں صرف کئے رہیں۔ جونہی ان میں سے کسی ایک کے دل میں خود غرضی اور خود نمائی کا جذبہ ابھرا ان کی اخوت ختم ہو گئی۔ جیسے رسّی اور لکڑی کے دونوں کنارے اپنے وسط میں آکر مل جاتے اور ایک ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی بھائی بھائی مل کر خیال و عمل بھی بالکل ایک ہی ہو تا ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ بھائی بھائی ہیں اگر یہ مرکزی وحدت نہیں ہے تو اخوت بھی نہیں ہے۔ آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان کے لحاظ سے بھائی کسے کہتے ہیں اور اخوت کے لئے کیا کیا چیزیں ضروری ہیں۔ یعنی دو بچوں کا ایک ماں باپ کے گھر پیدا ہو جانا ہی انہیں بھائی بھائی یا بھائی بہن نہیں بنا دیتا۔ اخیت کا یہ تعلق محض حیاتیاتی BIOLOGICAL ہوتا ہے۔ جس پر کسی کو اختیار نہیں ہوتا۔ اخوت کا صحیح تعلق اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب ایک ماں باپ کے گھر پیدا شدہ بچے فکر اور مقصد میں ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے بہی خواہ اور غمگسار ہوں۔ یعنی بھائی بھی وہی بھائی ہے جو دوست ہو۔

قرآن جو معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس معاشرہ میں بہن بھائیوں کا کیا مقام ہوگا۔ اسے تو آگے چل کر دیکھئے گا فی الحال اتنا دیکھ لیجئے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاں بہن بھائیوں کا جو تصور ہوتا تھا۔ اور جس تصور کے ماتحت وہ بھائی کو "اخ" اور بہن کو "اُخت" کہتے تھے آیا ہم مسلمانوں کے موجودہ معاشرہ میں اس تصور کا نام و نشان بھی ملتا ہے؟ قرآن تو ہر مومن کو دوسرے مومن کا بھائی "اخ" قرار دیتا ہے۔ اسے بھی چھوڑیئے، یہ دیکھئے کہ ماں جائے سگے بھائی بہنوں میں بھی ہمارے ہاں آج وہ صورت ہے یا نہیں جو عربی زبان کے لحاظ سے اخوت کے لئے ضروری تھی۔ یقیناً نہیں ہے۔

بہن بھائیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

قرآنی نقطۂ نظر سے ایک بھائی کو دوسرے بھائی بہن کے ساتھ بہترین حسن سلوک سے ساتھ پیش آنا چاہیئے معاشی مشکلات سے ان کی حفاظت کرنا ان کی بالیدگی اور نشو و نما کے لئے ضروری سامان مہیا کرنا۔ نرمی اور شفقت کے ساتھ ان سے پیش آنا۔ ان کی غمخواری کرنا تمام چیزیں اس میں داخل ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس سرزمین مصر میں ان کے بھائی پہنچے ہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات اپنے سگے چھوٹے بھائی سے ہوئی ہے تو اس کو قرآن کریم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلٰى يُوسُفَ اٰوٰى اِلَيْهِ اَخَاهُ قَالَ اِنِّىٓ اَنَا اَخُوكَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ (۱۲/۶۹)

اور جب برادران یوسف، یوسف کے پاس پہنچے تو یوسف نے اپنے (چھوٹے سگے) بھائی کو اپنے پاس پناہ دی اور کہا میں تیرا بھائی ہوں۔ جو کچھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ اس پر اب غمگین نہ رہو۔

آوٰی کے لفظ میں پناہ دینا، حفاظت کرنا۔ سامان نشو و نما مہیا کرنا۔ نرمی اور شفقت کے ساتھ پیش آنا۔ ساری ہی چیزیں آجاتی ہیں۔

بھائی قوت بازو ہوتے ہیں

جیسا کہ لفظ اخ کی تشریح کرتے ہوئے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ بھائی کو اخ کہتے ہی اس لئے ہیں کہ وہ مقصد میں ایک دوسرے کے مددگار اور شریک ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے باعث تقویت ہوتے ہیں۔ عمل اور خیال میں ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے ناصر و معین ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب موسیٰ علیہ السلام کو منصب رسالت سے نوازا گیا اور انہوں نے پیش نظر مہم کی اہمیت اور خطرناکی کا اندازہ لگایا تو بارہ الٰہی میں عرض کی۔

وَاَخِیْ هٰرُوْنُ هُوَ اَفْصَحُ مِنِّیْ لِسَانًا فَاَرْسِلْهُ مَعِیَ رِدْاً یُّصَدِّقُنِیْۤ
اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّكَذِّبُوْنِ ۝ (۲۸/۳۴)

میرا بھائی ہارون جس کی زبان مجھ سے زیادہ فصیح ہے۔ اسے میرا پشت پناہ بنا کر میرے ساتھ بھیج دیجئے کہ وہ میری تصدیق کرے۔ کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ مصر والے مجھے جھٹلا دینگے

یہاں موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کو اپنا پشت پناہ قرار دیا ہے۔ جس کے جواب میں ارشاد باری ہوتا ہے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِیْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطٰنًا فَلَا یَصِلُوْنَ
اِلَیْكُمَا ۝ (۲۸/۳۵)

حق تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہم تمہارے بازو کو تمہارے بھائی سے قوی کئے دیتے ہیں۔ اور تم دونوں کیلئے ایسی برہان کا انتظام کر دیتے ہیں کہ وہ لوگ تم پر کوئی دست درازی نہ کر سکیں۔

اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت ہارون علیہ السلام کی تائید و اعانت حاصل ہو جانے کو موسیٰ علیہ السلام کے بازوؤں کو قوی کر دینے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اسی درخواست کو دوسری جگہ یوں بیان کیا گیا ہے۔

وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِی ۝ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ۝ وَاَشْرِكْهُ
فِیْۤ اَمْرِیْ ۝ كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا
بَصِیْرًا ۝ (۲۰/۲۹-۳۵)

اور میرے گھر والوں میں سے میرے لئے ایک مددگار مقرر کر دے۔ یعنی میرے بھائی ہارون کو۔ کہ اس کے ذریعے سے تو میری کمر ہمت کو مضبوط کر دے اور اسے میرے کام میں میرا شریک بنا دے۔ تاکہ ہم دونوں مل کر کثرت کے ساتھ تیرے پروگرام کی تکمیل میں اپنی پوری قوت صرف کر سکیں۔ اور تیرے قانون کو بکثرت اپنے پیش نظر رکھ سکیں۔ بلاشبہ تو ہمیں دیکھ رہا ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں۔

یہاں بھی ہارون علیہ السلام کو اپنا معاون و مددگار (وزیر) اور کمر ہمت کی تقویت کا باعث اور پشت پناہ ظاہر کیا گیا ہے۔ مذکورہ بالا آیات

سے ظاہر ہے کہ بھائی بھائی آپس میں ایک دوسرے کے لئے قوت بازو اور پشت پناہ ہوتے ہیں۔ ہر بھائی دوسرے سے طاقت حاصل کرتا ہے۔ اور اس احساس سے ان کی جرأت اور ہمت لامحدود ہو جاتی ہے۔

ایک بھائی دوسرے کا محافظ ہوتا ہے ایک بھائی دوسرے بھائی کے لئے آنیوالی مشکلات کے لئے ڈھال بن جاتا ہے وہ ایک دوسرے کی حفاظت کرتے ہیں۔ ایک کا کہیں پسینہ گرتا ہے تو دوسرا خون بہانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف جب ان کے بھائیوں نے سازش کی اور انھیں اپنے ساتھ جنگل میں لے جانا چاہا تو باپ سے اجازت لیتے وقت جہاں اور باتوں کا انھیں یقین دلایا وہیں ساتھ ہی یہ یقین بھی دلایا گیا تھا کہ وہ اُن کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔ اور ان پر کوئی آنچ نہیں آنے دیں گے۔

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۲/۱۲)

اسے آپ کل کو ہمارے ساتھ بھیج دیجئے (جنگل میں) کھائے پئے گا۔ اور کھیلے کودے گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم اس کی پوری پوری حفاظت کریں گے۔

اگر بھائیوں میں اخوت نہ رہے اگر بھائیوں میں یہ اوصاف نہ رہیں۔ اور ان کے درمیان سے اخوت کا رشتہ گم ہو جائے یعنی ان میں یگانگت اور محبت باقی نہ رہے تو اس کے برے نتائج نہایت ہی دوررس اور تباہ کن ہوتے ہیں۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ۝ (۱۲/۷)

یوسف اور ان کے بھائیوں کے واقعات میں ضرورت مندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کا واقعہ کئی جہتوں سے عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے سرمایہ بصیرت ہے۔ دوسری جہات کو تو جانے دیجئے۔ محض بھائیوں کے نقطۂ نظر سے اس واقعہ پر غور کیجئے تو کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے والد اور خاندان سے یوں بچھڑنا۔ یوسف کی جدائی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا ماہی بے آب کی طرح تڑپتے رہنا حضرت یوسف علیہ السلام کا ایک معمولی غلام کی حیثیت سے مصر میں داخل ہونا عزیز مصر کی بیوی اور دوسری بیگمات کی خواہشات نفس کا ناکام نشانہ بننا اور اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کی خاطر مسلسل کئی سال تک جیل خانہ میں قیدیوں کی طرح زندگی گذارنا اور پھر دوسری طرف برادران یوسف کے قلبی عدم سکون اور اضطراب کا یہ عالم کہ خلاف توقع یعقوب علیہ السلام نے ایک دن بھی ان کے اس گھڑے ہوئے افسانہ پر یقین نہ کیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا ہے۔ بیٹوں کی طرف سے باپ کی اس بے اطمینانی کے بعد کیا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس مقصد کے لئے انھوں نے یوسف کو باپ کی نگاہوں سے اوجھل کیا تھا۔ اس میں وہ کامیاب ہو سکے ہوں گے۔ یقیناً اس واقعہ کے بعد اس بے چینی اور اضطراب میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہو گا۔ آپ ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرما لیجئے کہ کیا مصائب و مشکلات کا یہ سارا سلسلہ اور آلام و آفات کی یہ ساری زنجیر اس چھوٹے سے ایک واقعہ کا نتیجہ نہیں تھی کہ برادران یوسف کے دل میں حضرت یوسف

کی طرف سے یہ حسد پیدا ہوا کہ باپ کی نظر شفقت بہ نسبت ہمارے یوسف پر زیادہ کیوں ہے۔ اور انہوں نے جوش رقابت میں یہ فیصلہ کر لیا کہ یوسف کو باپ کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا جائے۔

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ ۝ (۱۲/۸-۹)

جب انہوں نے کہا کہ یوسف اور اس کا بھائی ہماری بہ نسبت ہمارے باپ کی نگاہوں میں زیادہ محبوب ہیں۔ حالانکہ ہم ایک پوری جماعت ہیں۔ یقیناً ہمارا باپ ایک کھلی گمراہی میں مبتلا ہے۔ یوسف کو مار ڈالو یا اسے کسی ایسی سرزمین میں پھینک دو کہ (وہ باپ کی نگاہوں سے دور ہو جائے اور) پھر تمہارے باپ کی توجہات صرف تمہارے لئے ہی رہ جائیں۔ اس کے بعد تم صلاحیت بخش کام کرنے والے بن جانا۔

اس حسد و رقابت کے مظاہرہ کے بعد جو نتائج مرتب ہوئے، وہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام ہی کے لئے باعث اذیت اور وجہ ابتلاء نہیں تھے۔ بلکہ برادران یوسف کے لئے وہ بھی کچھ خوش آئند ثابت نہیں ہوئے۔ اس چھوٹے سے ایک واقعہ نے اسرائیل کے گھرانے کے خانگی سکون و اطمینان کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ سارے کنبہ کو ایک سخت آزمائش اور ابتلاء میں ڈال دیا۔

اولاد کے درمیان امتیازی سلوک

ہمیں یقین ہے کہ یعقوب علیہ السلام، یوسف علیہ السلام کے ساتھ کوئی ایسا امتیازی سلوک کے تعلقاً نہیں کرتے ہوں گے۔ جس سے دوسرے بچوں کی حق تلفی ہوتی ہو۔ لیکن پھر بھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے محتاط سلوک نے بھی جسے دوسرے بھائی امتیازی سلوک سمجھتے تھے۔ خاندان اسرائیل پر مصائب و آلام کے کس قدر پہاڑ توڑ ڈالے تھے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جو والدین واقعی طور پر اپنی اولاد کے درمیان کسی امتیازی سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں وہ کتنے بڑے فتنے کو دعوت دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر صرف پاکستان میں ان گھرانوں کے حالات و کوائف کا تجزیہ کیا جائے جن میں بھائیوں بھائیوں یا بھائیوں اور بہنوں یا بہنوں اور بہنوں کے تعلقات میں ناخوشگواری کے اثرات پائے جاتے ہوں تو نناوے فیصدی واقعات ضرور ایسے نکلیں گے جن کی تہہ میں یہی چیز نکلے گی کہ اس ناخوشگواری کا سبب والدین کا بھائی بہنوں کے درمیان کوئی امتیازی سلوک تھا جو بچپن سے ان کے تحت الشعور میں پرورش پاتا چلا رہا تھا۔ اور جس نے بالآخر بڑے ہو کر فلاں واقعہ سے متاثر ہو کر کوہ آتش فشاں کی صورت اختیار کر لی۔ لہٰذا اس ضمن میں اتنا ہی نہیں کہ بھائی بہنوں کو محتاط رہنے اور ایک دوسرے کے حقوق و واجبات کو پہچاننے کی ضرورت ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ بھائی بہنوں سے زیادہ والدین کو بھی انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بچوں کا ذہن ایک صاف سلیٹ کی طرح ہوتا ہے۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں۔ وہ ہمارے اعمال سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور ان کے تحت الشعور میں غیر محسوس طریقہ پر یہ چیزیں پرورش پاتی رہتی ہیں۔ جو وقت آنے پر کسی بھلے

سے پھوٹ پڑتی ہیں۔

بھائیوں کیلئے نیک آرزوئیں

ہمیں ہمیشہ اپنے دل میں بھائیوں کے لئے نیک آرزوئیں رکھنی چاہئیں، حتیٰ کہ اگر ہم کسی پریشانی میں مبتلا ہیں، یا انتہائی طیش، اور غضب کی حالت میں ہیں تب بھی انسانیت کا کمال یہ ہے کہ ہم ایسے موقع پر بھی اس فرض سے غافل نہ ہوں۔ اور پھر بھی اپنے دلوں میں ان کے لئے اچھی خواہشات اور نیک آرزوئیں ہی رکھیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے جاتے ہیں اور اپنی غیر موجودگی کے لئے بنی اسرائیل میں حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا نائب اور خلیفہ بنا جاتے ہیں۔ بنی اسرائیل سحر سامری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اور حضرت موسیٰ کی غیر موجودگی میں گوسالہ پرستی شروع کر دیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ جب واپس تشریف لاتے ہیں تو یہ حالات سن کر غصے سے بے تاب ہو جاتے ہیں۔ انھیں یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید حضرت ہارون علیہ السلام نے اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کی ہوگی کہ چند دن میں پوری قوم یوں گمراہ ہوگئی۔ وہ حضرت ہارون پر عتاب فرماتے ہیں۔ انھیں فہمائش کرتے ہیں۔ حضرت ہارون علیہ السلام اپنا عذر بیان کرتے ہیں اور حالات کو صحیح صورت میں پیش کرتے ہیں۔ یہ سوال و جواب ہو رہے ہیں اور ان سوالات و جوابات کے ضمن میں بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام جو بارگاہ الٰہی میں التجا پیش کرتے ہیں وہ یہ ہوتی ہے۔

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِأَخِي وَأَدْخِلْنَا فِي رَحْمَتِكَ ۖ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ○ (۷/۱۵۱)

موسیٰ نے بارگاہِ ایزدی میں التجا فرمائی کہ اے میرے پروردگار! مجھے اور میرے بھائی کو سامانِ حفاظت عطا فرما اور اپنی رحمت و نوازش میں داخل فرمالے۔ تو رحم فرمانے والوں میں سے سب سے بہتر رحم فرمانے والا ہے۔

اپنی مصیبت میں بھائی کو پھنسا دینا مجرمانہ روش ہے

اس کے برعکس کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اسے اپنی ہنرمندی سمجھتے ہیں کہ جس مصیبت میں خود پھنسے ہوئے ہوں اس میں اپنے کسی بھائی کو پھنسا کر صاف نکل جائیں، مگر ایسا کرنا سخت قسم کی مجرمانہ روش ہے جو ایک مومن کی روش تو ہو نہیں سکتی۔ قرآن کریم نے کفار و مجرمین کی یہ روش بیان کی ہے کہ جب فیصلہ کن گھڑی آجائے گی تو ان خاندانی کثرت پر گھمنڈ کرنیوالوں کا حال یہ ہوگا کہ ان میں سے ہر شخص کی خواہش اور آرزو ہوگی کہ کاش کسی طرح اس دن کے عذاب سے وہ خود تو بچ جائیں۔ اور اس کی جگہ اس کے بیٹے، بیوی اور بھائی پھنس جائیں۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ○ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ○ (۷۰/۱۱-۱۲)

مجرم لوگوں کی اس دن یہ آرزو ہوگی کہ کاش وہ اپنے بیٹوں، بیوی اور بھائی کو پھنسا کر

اس دن کے عذاب سے خود کسی طرح چھوٹ جائیں۔

مگر ایک مومن کی زندگی کی یہ روش ہو نہیں سکتی۔ مومن کی روش تو اس کے مقابلہ میں یہ ہوتی ہے کہ وہ سگا بھائی تو ایک طرف رہا اپنے دینی بھائی کو بھی کسی مصیبت میں گرفتار نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اگر اپنے کسی مسلمان بھائی کو کسی مصیبت میں گرفتار دیکھتا ہے تو اس کی پہلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کی یہ مصیبت اگر میں دور نہ کر سکوں تو اس کی مصیبت خود لے لوں اور اسے کسی طرح اس سے نجات مل جائے۔

وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۚ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۹-۵۹)

مومنین، دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ خود بھی بھوک کی انتہائی شدت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ جو لوگ نفسانی حرص و آز سے بچا لئے جائیں وہی لوگ ہیں جن کی کھیتیاں پروان چڑھتی ہیں۔

بھائیوں سے آنکھ چرانا

مصیبت میں بھائی بہن اور دوسرے رشتہ داروں سے آنکھیں چرانا اور ان کو چھوڑ کر بھاگ جانے کی فکر کرنا بھی مجرمین ہی کا شیوہ ہوتا ہے۔ ایک مومن کے حیطۂ وہم میں بھی اس قسم کا خیال نہیں آسکتا۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ (۸۰-۳۴-۳۶)

اس دن کا خیال کرو جب حالت یہ ہوگی کہ آدمی اپنے بھائی سے، اپنی ماں سے، اپنے باپ سے اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد تک سے (آنکھیں چرا کر) بھاگ جانے کی فکر کرے گا۔

ان تمام مقامات میں اس بنیادی حقیقت کو کبھی نظر انداز نہ ہونے دیں کہ بھائی کہتے کسے ہیں؟ اس کی تفصیل شروع میں بیان ہو چکی ہے

عذر پذیری

دانستہ یا نادانستہ طور پر کچھ ایسی باتیں بسا اوقات پیدا ہو جاتی ہیں کہ جن کی وجہ سے بھائیوں بھائیوں یا بھائیوں اور بہنوں کے درمیان تلخی آجاتی ہے مگر اس تلخی کو مستقل طور پر قائم نہیں رہنا چاہیئے۔ ان تلخیوں کا پیدا ہو جانا مقتضائے بشریت ہے۔ جب دو برتن ایک ساتھ رہتے ہیں تو وہ لامحالہ کبھی نہ کبھی کھڑک بھی جاتے ہیں۔ لیکن ان کا ہر وقت کھڑکتے رہنا سخت نقصان رساں اور معاشرے کے لئے تباہ کن ہوتا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے اس تلخی اور ناگواری کو ختم کر دینا چاہیئے۔ جس کی طرف سے زیادتی ہوئی ہے اسے اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیئے۔ اور دوسرے کو عفو و درگذر سے کام لینا چاہیئے۔ برادرانِ یوسف نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ بدسلوکی کرنے میں کون سی کسر باقی چھوڑ دی تھی۔ لیکن جب انہوں نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ تو یوسف علیہ السلام نے بلا پس و پیش ان کی معذرت کو فوراً قبول فرما لیا۔

قَالُوا تَاللَّهِ لَقَدْ آثَرَكَ اللَّهُ عَلَيْنَا وَإِن كُنَّا لَخَاطِئِينَ ۝ قَالَ لَا

تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللَّهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ ○ (۱۲/۹۲)

برادرانِ یوسفؑ نے کہا۔ بخدا یہ واقعہ ہے کہ خدا نے بہت سی صلاحیتوں میں تمہیں ہم پر ترجیح دی ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم نہایت ہی غلط کار تھے۔ یوسفؑ نے کہا آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ خدا تمہیں سامانِ حفاظت عطا فرمائے۔ وہ رحم کرنے والوں میں سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔

بھائی کی خبر گیری

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بھائی کا یہ فریضہ ہے کہ وہ بہن کی خبر گیری کرے اور بہن کا یہ فریضہ نہیں ہے۔ بلکہ بہن اگر اس قابل بھی ہو۔ تب بھی اس کے احسان سے بھائی کو سرگراں نہیں ہونا چاہیئے بہن کا احسان لینا معاشرے میں نہایت ہی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر قرآن کریم نے اپنے دفتین میں ایسا کوئی واقعہ محفوظ نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہو کہ کسی بھائی نے اپنی بہن کے لئے کچھ کیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی بہن کا ایک واقعہ اپنے دفتین میں محفوظ کیا ہے۔ جس نے انتہائی خطرناک موقعہ پر بھائی کی خبر گیری کی اور اس کے لئے بہتر انتظام اور بہتر ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوتے ہیں۔ اشارۂ خداوندی کے مطابق ان کو ایک بکس میں بند کر کے ان کی والدہ دریائے نیل میں بہا دیتی ہیں۔ تاکہ مشیت کا وہ پروگرام پورا ہو سکے جو اسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ روبہ عمل لانا تھا۔ بچہ کو دریا میں بہا دیا گیا۔ لیکن ماں کی ماتا چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ ماں نے بیٹی سے کہا کہ ذرا احتیاط کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ مگر اس طرح سے کہ تم پر کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ تمہارا اس بچے سے کوئی تعلق ہے اور دیکھو کہ اس بچے کے ساتھ کیا گزرتی ہے۔ بہن آہستہ آہستہ اس صندوق کے ساتھ چلتی رہی۔ صندوق بہتا بہتا محلِ شاہی میں پہنچا۔ جہاں اسے نکال لیا گیا۔ بکس کو کھولا گیا تو ایک بچہ اس میں لیٹا ہوا تھا۔ ملکۂ فرعون نے خواہش کی کہ اس بچہ کو وہ پرورش کرے گی۔ فرعون نے ملکہ کی اس خواہش کی پذیرائی کی اور ہر طرف دودھ پلانے والیوں کی تلاش میں ہرکارے دوڑ گئے۔ جو آیا آتی ہے وہ ہر چند کوشش کرتی ہے مگر حضرت موسیٰ کسی کا دودھ نہیں پیتے۔ لوگوں کی نظروں سے بچتے بچاتے حضرت موسیٰ کی بہن شاہی محلسرا میں داخل ہوتی ہیں۔ اور باتوں باتوں میں کہہ دیتی ہیں کہ میری نظر میں بھی ایک گھرانا ایسا موجود ہے جو اس بچہ کی پرورش کر سکتا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ وہ لوگ اس بچے کی خیرخواہی کے ساتھ پرورش کر سکیں گے۔ موسیٰؑ کی بہن کی نشان دہی پر ان کی ماں بلائی جاتی ہے۔ جن کا دودھ حضرت موسیٰؑ پی لیتے ہیں۔ اور اس طرح بچہ پھر اپنی ماں کی گود میں واپس آ جاتا ہے۔

وَقَالَتْ لِأُخْتِهِ قُصِّيهِ ۖ فَبَصُرَتْ بِهِ عَن جُنُبٍ وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ○
وَحَرَّمْنَا عَلَيْهِ الْمَرَاضِعَ مِن قَبْلُ فَقَالَتْ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ أَهْلِ بَيْتٍ
يَكْفُلُونَهُ لَكُمْ وَهُمْ لَهُ نَاصِحُونَ ○ فَرَدَدْنَاهُ إِلَىٰ أُمِّهِ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا
وَلَا تَحْزَنَ وَلِتَعْلَمَ أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ○ (۲۸/۱۱-۱۳)

موسیٰؑ کی ماں نے اس کی بہن سے کہا کہ اس کے پیچھے پیچھے جاؤ۔ چنانچہ وہ اس کو اجنبی بن کر احتیاط کے ساتھ دیکھتی چلی گئی کہ لوگوں کو اس کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ ہم نے پہلے سے دودھ پلانیوالیوں کا دودھ

> موسیٰ کے لئے حرام کردیا تھا (چنانچہ حضرت موسیٰ نے کسی دودھ پلانے والی کا دودھ نہیں چکھا) تو موسیٰ کی بہن نے (فرعون کے لوگوں سے) کہا کیا میں تمہیں ایک ایسا گھرانا بتاؤں کہ جو تمہارے لئے اس بچہ کی پرورش کردیں۔ اور وہ اس بچے کے لئے خیر خواہ اور مشفق بھی ہوں! چنانچہ اس ترکیب سے ہم نے موسیٰ کو اس کی ماں کے پاس واپس بھیجدیا۔ تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں اور وہ غمگین نہ ہو۔ اور اسے مشاہدہ ہو جائے کہ خدا کا وعدہ بالکل سچ تھا۔ اگرچہ اس بات کو بہت سے لوگ نہیں جانتے۔

ذرا خیال تو فرمایئے کہ کتنا خطرناک اور کٹھن مشن تھا جس پر موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی بہن کو بھیجا تھا اور انھوں نے کس ہوشیاری اور کامیابی کے ساتھ اس مشن کو پورا کیا کہ بچہ پھر اپنی ماں کی گود میں واپس آگیا۔ اس فرق کے ساتھ کہ اب وہ بچے کی پرورش اپنے لئے نہیں کررہی تھیں بلکہ شہنشاہ مصر کے لئے ایک شاہزادہ کی پرورش کررہی تھیں جس کا ان کو معقول معاوضہ ملتا ہوگا۔ اگر بھائی کے لئے بہن کا احسان مند ہونا کوئی فی الواقعہ معیوب بات ہوتی تو کیا مشیت الٰہی حضرت موسیٰ کے لئے اس کو پسند کرسکتی تھی۔ ہرگز نہیں. لہٰذا یہ تصور قطعی غیر قرآنی ہے کہ بھائیوں کو بہنوں کا کوئی احسان نہیں لینا چاہیئے۔

بہنوں کے گھر سے کھانا

ہندوؤں کی معاشرت نے جو اثرات ہم پر مرتب کئے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عام طور پر بہنوں کے ہاں سے کھانا پینا۔ ان سے کسی قسم کی مدد لینا بہت بُرا اور مذموم سمجھا جاتا ہے۔ بلکہ بہنوں کا یہ حق سمجھا جاتا ہے کہ جب کبھی وہ آئیں بھائی ان کو مہینے دو مہینے اپنے ہاں مہمان رکھے اور جاتے ہوئے پوٹلی باندھ کر ان کے ساتھ کپڑے اس میں کچھ نقدی۔ کچھ جوڑے اور کچھ مٹھائیاں ہونی چاہئیں۔ اسے ہمارے ہاں ددھیالی کا حق سمجھا جاتا ہے۔ بہن جب اپنی سسرال جاتی ہے تو کرید کرید کر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ بھائی کے ہاں سے کیا لائی ہو۔ اگر وہ غریب کچھ لے کر نہیں آئی تو طعنوں اور جھڑکوں سے اس کا دل جگر چھلنی کیا جاتا ہے۔ یہ خالصتاً ہندوانہ معاشرہ کی چیز ہے جس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ ہندوؤں کے ہاں چونکہ باپ کی جائداد میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ہندو معاشرے نے بھائیوں کے ذمہ یہ فرض عائد کردیا ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً بہنوں کو بلاتے رہیں اور اس طرح ان کی مدد اور خبر گیری کرتے رہیں لیکن ان کے ہاں ان بہنوں کو بطور استحقاق کچھ نہیں ملتا بلکہ بطور خیرات (دان پُن) دیا جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے مردوں اور عورتوں کے حقوق میں ایسا کوئی امتیاز نہیں برتا۔ لڑکی بھی اسی طرح باپ کے ترکہ میں سے حصہ پاتی ہے جس طرح لڑکے پاتے ہیں۔ اس لئے اسلام نے بھائیوں کے ذمہ کچھ ایسے واجبات نہیں رکھے۔ جن کی عدم ادائیگی طعن و تشنیع کا موجب بن سکے۔ دیکھا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں محض اپنی ناک سلامت رکھنے کے لئے، اور بہنوں کو سسرال کے طعنوں اور جھڑکوں سے بچانے کے لئے کتنی ہی تنگی اور دشواری کیوں نہ ہو بھائیوں کو قرض کرنا پڑتا ہے اور ہزار دشواریاں مول لینی پڑتی ہیں، ورنہ برادری میں ان کی ناک کٹ جاتی ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک دوسری چیز یہ ہے کہ بہنوں کے ہاں جانا۔ ٹھہرنا۔ ان کے ہاں کھانا پینا بھی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ قرآنی معاشرہ میں یہ بھی کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ بھائی اور بہن میں کوئی خاص فرق نہیں ہے اگر ہم اپنے بھائی کے ہاں جاسکتے ہیں، وہاں کھاپی سکتے ہیں تو بہنوں کے ہاں بھی جاسکتے اور ان کے ہاں سے کھاپی سکتے ہیں۔ بہنوں کے اگر کچھ حقوق و واجبات بھائیوں کے ذمہ ہیں تو بھائیوں کے کچھ حقوق و واجبات بھی بہنوں کے ذمہ

غیر قرآنی معاشرہ میں اصول یہ ہے کہ جس کے پاس اپنی ذاتی ضروریات سے کچھ زیادہ ہو وہ ان لوگوں کا حق ہے جن کو اس کی ضرورت ہے اور اس میں قرابت داروں کا حق سب سے مقدم ہو اگر بھائی کے پاس اپنی ضرورت سے کچھ زیادہ ہو اور بہن ضرورتمند ہے تو وہ بطور حق کے بھائی سے اپنی ضروریات کے مطابق ہر وقت لے سکتی ہے۔ ایسے ہی بہن کے پاس کچھ اپنی ضرورت سے زیادہ ہو اور بھائی ضرورت مند ہو تو اسی طرح وہ بھی بطور استحقاق کے اپنی ضروریات کے مطابق بہن سے لے سکتا ہے۔ بہرحال قرآنی معاشرے میں نہ بہن کے ذمہ بھائی کا کوئی مقررہ ٹیکس ہے اور نہ بہن کا بھائی کے ذمہ کچھ تاوان۔ اس کا مدار صرف دو چیزوں پر ہے۔ کسی ایک کے پاس اپنی بنیادی اہم ضروریات سے زیادہ مال کا ہونا اور دوسرے کا ضرورتمند ہونا۔ اگر بھائی خود ضرورت مند ہے اور اس کے پاس اتنا بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی ضروریات کو کما حقہٗ پورا کر سکے تو محض ناک سلامت رکھنے کے لئے اسے قطعاً مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بہن کا مقررہ ٹیکس جیسے بھی بن پڑے ضرور ہی ادا کرے۔

قرآن کریم میں ہے۔

لَيْسَ عَلَى الْأَعْمَىٰ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَلَا عَلَى الْمَرِيضِ حَرَجٌ وَلَا عَلَىٰ
أَنفُسِكُمْ أَن تَأْكُلُوا مِن بُيُوتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ آبَائِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أُمَّهَاتِكُمْ
أَوْ بُيُوتِ إِخْوَانِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخَوَاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَعْمَامِكُمْ أَوْ بُيُوتِ
عَمَّاتِكُمْ أَوْ بُيُوتِ أَخْوَالِكُمْ أَوْ بُيُوتِ خَالَاتِكُمْ أَوْ مَا مَلَكْتُم مَّفَاتِحَهُ
أَوْ صَدِيقِكُمْ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَأْكُلُوا جَمِيعًا أَوْ أَشْتَاتًا (۲۴/۶۱)

اندھے پر، لنگڑے پر، مریض اور بیمار پر کوئی حرج نہیں ہے۔ خود تم پر بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں سے، اپنے والدین کے گھروں سے، اپنی ماؤں کے گھروں سے یا اپنے بھائیوں کے گھروں سے اپنی بہنوں کے گھروں سے، اپنے چچاؤں کے گھروں سے، اپنی پھوپھیوں کے گھروں سے، اپنی خالاؤں کے گھروں سے یا ان گھروں سے جن کی کنجیوں کے تم مالک ہو یا اپنے دوست کے گھروں سے تم کھانے پینے کی چیزیں کھاؤ۔ اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ تم سب اکٹھے ہو کر کھاؤ۔ اور اس میں بھی کوئی حرج نہیں کہ الگ الگ کھاؤ۔

لہٰذا بہنوں کے گھر جانا اور ان کے ہاں سے کھانا پینا کوئی جرم یا عیب کی بات نہیں ہے۔ بھائی کے لئے بہن کا گھر ایسا ہی ہے جیسے خود اس بہن کے لئے بھائی کا گھر۔ یا ایک بھائی کے لئے دوسرے بھائی کا گھر۔ ان رشتہ داریوں میں جو امتیازات پیدا کئے جاتے ہیں۔ وہ غیر قرآنی ہیں۔

بہنوں کو بھائیوں سے غیر معمولی تکلفات نہ ہونے چاہئیں

حیا عورت کا زیور ہے۔ اور قرآن کریم نے عورتوں کی اس خصوصیت پر بہت زور دیا ہے۔ اور جا بجا تاکید

فرمائی ہے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی زینت و آرائش کو غیر مردوں کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ لیکن دیگر قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اس نے بھائیوں کا بھی استثنا فرمایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

قُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ
زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ
بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ

.... (۲۴/۳۱)

اے پیغمبر اسلام! مومن عورتوں کو تاکید کر دیجئے کہ وہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی عصمت کی حفاظت کریں اور اپنی زینت و آرائش کو ظاہر نہ کریں۔ بجز ان حصہ ہائے جسم کے جو از خود ہی ظاہر ہو جاتے ہوں۔ وہ اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیاں ڈالے رہا کریں۔ اور اپنی زینت و آرائش کو بجز اپنے شوہروں، خسروں، بیٹوں، شوہر کے بیٹوں، بھائیوں، بھتیجوں، بھانجوں اور اپنی عورتوں کے کسی اور پر ظاہر نہ ہونے دیا کریں۔

لہٰذا بہنوں کو اپنے بھائیوں سے وہ تمام بے جا قسم کے تکلفات نہیں برتنے چاہئیں جن سے غیریت کی بو آتی ہو۔

جذبات اخوت کی رعایت

بھائیوں کو بہنوں کے ساتھ اور بہنوں کو بھائیوں کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں کرنی چاہیئے جس سے اخوت کے جذبات کو ٹھیس لگتی ہو۔ قرآن کریم نے مردوں کے لئے جہاں بعض دوسرے قریبی رشتے مناکحت کے لئے حرام قرار دیئے ہیں۔ وہیں ساتھ ہی اس کو بھی حرام ٹھہرا دیا ہے کہ کوئی شخص بیک وقت دو بہنوں سے شادی کرے کیونکہ سوتن کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ ایک سوت کو دوسری سوت سے لامحالہ شکایت ہوتی ہی ہے اور دل میں صفائی نہیں رہتی۔

واضح رہے کہ اسلام نے تعدد ازدواج کی اجازت خاص ہنگامی حالات میں دی ہے اور اس کے ساتھ بھی عدل اور مساوات کی کڑی شرط رکھ دی ہے۔ جس کی موجودگی میں اس کا بہت ہی کم امکان رہ جاتا ہے کہ کسی ایک سوت کو دوسری سوت سے کوئی جائز وجہ شکایت پیدا ہو سکے۔ لیکن اتنی بندشوں کے بعد بھی قرآن کریم اس کی اجازت نہیں دیتا کہ دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں لے لیا جائے کیونکہ قرآن خالق کائنات کا کلام ہے اور وہ خوب جانتا ہے کہ انسان دو بیویوں کی صورت میں عدل و مساوات کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کر سکتا ہے۔ اس کے مساویانہ سلوک سے اگر ان دو بیویوں میں جذبات حسد و عداوت نہ بھی بیدار ہوں۔ بایں ہمہ یہ ایک حقیقت ہے کہ سوتنوں میں باہمی محبت اور پیار مشکل پیدا ہو سکتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے نکاح دو بہنوں کے درمیان قطع رحمی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اس لئے قرآن نے اس کا دروازہ ہی بند کرنا ضروری سمجھا ہے۔

مومن کا بھائی کافر نہیں ہو سکتا

گزشتہ اوراق میں آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے بھائی بھائی اور بھائی بہن کے

رشتوں کو کس قدر اہمیت دی ہے۔ لیکن یہ حقیقت پھر نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ یہ تمام ہدایات اسی وقت ہیں جبکہ بھائی یا بہن بھی مومن ہوں۔ لیکن اگر خدانخواستہ وہ ایمان کی دولت سے محروم ہیں تو پھر تمہارا ان سے کوئی رشتہ نہیں۔ کیونکہ قرآن کی نگاہ میں سب سے بڑا رشتہ ایمان کا رشتہ ہے۔ اگر یہ رشتہ موجود ہے تو باقی رشتے بھی موجود ہیں۔ اگر یہ بنیادی رشتہ ہی موجود نہیں تو پھر کسی دوسرے رشتہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم صاف صاف کہہ دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ ۚ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (۹/۲۳)

اے پیروان دعوتِ ایمانی! اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو پسند کرتے ہوں تو اپنا مددگار اور ولی نہ بناؤ۔ تم میں سے جو انھیں اپنا مددگار اور ولی بنائے گا۔ تو وہ ظالم ہوں گے۔

صرف یہ ہدایت ہی نہیں بلکہ ساتھ ہی یہ چیلنج بھی ہے کہ

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۝ (۹/۲۴)

اے پیغمبر اسلام! تم کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ بیٹے۔ بھائی۔ بیویاں۔ خاندان اور وہ اموال جو تم حاصل کر چکے ہو اور وہ تجارت جس کے مندا پڑجانے کا تمہیں اندیشہ ہے۔ اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں تمہارے نزدیک خدا، رسول اور خدا کے راستہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو حتیٰ کہ خدا اپنا فیصلہ صادر کر دے اور یاد رکھو کہ خدا راستے سے کترا جانے والوں کو کبھی راہنمائی نہیں فرمایا کرتا۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اگر بھائیوں میں ہم آہنگی فکر و نظر نہیں رہی تو محض اس لئے کہ وہ ایک ماں باپ کے گھر میں پیدا ہو گئے تھے۔ ان میں یگانگت کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ایسے حالات میں ان کے برادرانہ تعلقات بھی باقی نہیں رہ سکتے۔

اسلامی معاشرت

از:- پرویز

مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ قرآن کے آئینہ میں

۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے

نقد و نظر

۱۔ جماعتِ مجاہدین از محترم غلام رسول صاحب مہر۔ شائع کردہ کتاب منزل کشمیری بازار لاہور۔ ضخامت قریب سوا تین سو صفحات طباعت، کتابت عمدہ۔ قیمت مجلد سات روپے

محترم مہر صاحب کی مایۂ ناز تصنیف۔ "سید احمد شہید" کا ذکر ان صفحات پر اس سے پہلے آچکا ہے۔ ہمارے نزدیک مہر صاحب کی اتنی ہمت ہی کچھ کم قابل داد نہ تھی کہ اس کے بعد اس سلسلۃ الذہب کی اگلی کڑی بھی ہمارے سامنے آگئی (اور وہ ابھی اس سلسلہ کو جاری رکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں) اللہ تعالیٰ اس فرہادکی کوہکنی اور خارا شگافی کو جوئے شیر سے نوازے۔

جیسا کہ ہم سیرت سید شہید کے ضمن میں بتا چکے ہیں سید صاحب کی تحریک جہاد

ترکش مارا خدنگِ آخریں

تھی۔ مہر صاحب نے عشق و عمل کی اس داستانِ جلیلہ کے بکھرے ہوئے اوراق کی شیرازہ بندی سے ان لوگوں پر بڑا احسان کیا جو خون شہدا کی رنگینی کو وجہ تزئین کائنات سمجھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں انھوں نے سید شہیدؒ کی جماعت کے تنظیمی حالات اور ان کے ان اکابر رفقاء کے سوانح حیات مرتب کئے ہیں جو سید صاحب کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے یا جو ان کے بعد بھی زندہ رہے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

اس تحریک کا مقصد خود سید صاحب کے الفاظ میں یہ تھا

ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل درپیش ہے اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں۔ اس واسطے کہ وہ کام یعنی سلوک اس جہاد کے تابع ہے۔ اگر کوئی شخص تمام دن روزے رکھے۔ تمام رات زہد و ریاضت میں بسر کرے۔ یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آجائے۔ اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو رنجک اڑائے تاکہ وہ مقابلہ کفار میں بندوق لگاتے وقت آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے رتبہ کو ہرگز نہ پہنچے گا۔

دوسرے مقام پر آپ فرماتے ہیں۔

میرا طریقہ وہی ہے جو حبیبِ ما سرور انبیاء نے اختیار فرمایا ایک وقت سوکھی روٹی پیٹ بھر کر کھا لیتا ہوں اور خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ میرا لشکر اپنی چند مخلص مہاجروں پر مشتمل ہے۔ جنھوں نے محض رب العالمین کے دین کی خدمت کیلئے کمر باندھی اور اپنی طرف سے جانیں راہ خدا میں قربانی کے لئے پیش کر دیں۔

اس لشکر کے سپاہیوں کے متعلق سید صاحب نے کہا تھا کہ

ان شہداء میں سے ہر ایک اپنے وطن کی انسانیت کا خلاصہ اور اسلامیت کا لب لباب تھا۔

ان کی عفت و پاکبازی کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ ایک صاحب نے گاؤں کی عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا کہ

سید بادشاہ کے ساتھی یا تو نفسانی خواہشات سے محروم ہیں یا اولیاء ہیں۔ پن چکیوں پر آٹا پسوانے آتے ہیں۔ وہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی مجاہد کی نگاہ عورت کی طرف اٹھی ہو۔

لشکر میں تقسیم کار اور فرائض و واجبات کا انداز یہ تھا کہ

ہر جماعت متعدد دستوں میں منقسم تھی۔ ایک دستہ میں کم سے کم بیس اور زیادہ سے زیادہ پچیس آدمی ہوتے تھے مقررہ دستور کے مطابق پورے دستہ کا کھانا ایک جگہ پکتا تھا۔ جتنی نفری ہوتی رسدخانہ سے ہر دستہ کو رسد مل جاتی لکڑیاں اور پانی دستہ کے مختلف آدمی باری باری لایا کرتے تھے۔ جنس سب کو مساوی مقدار میں ملتی تھی۔ چھوٹے یا بڑے، سرعسکر یا سپاہی میں کوئی فرق نہ تھا۔ حتیٰ کہ خود سید صاحب بھی اس مساوات سے مستثنیٰ نہ تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کے لئے دن مقرر ہو جاتا تھا۔ سید صاحب بھی اپنی جماعت کے ساتھ جاتے اور برابر لکڑیاں کاٹتے۔

مجاہدین نہ کوئی تنخواہ لیتے تھے نہ کوئی معاوضہ

ان میں محبت اور اخوت کے مستحکم رشتے موجود تھے جو ایک خاندان کے مختلف افراد میں بھی شاذ ہی ملیں گے۔

اس لئے کہ سید صاحب کی تعلیم یہ تھی کہ

مسلمان کو چاہیئے کہ لذیذ کھانوں، میٹھی چیزوں، یا ہر قسم کی میووں وغیرہ کے سلسلہ میں جن کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے۔ دوسرے مسلمان بھائیوں کو اپنے آپ پر مقدم رکھے اور خود پیچھے رہے۔ لیکن جب رنج و تکلیف کا موقعہ آ جائے تو اپنے آپ کو دوسروں سے آگے رکھے اور ان پر بار تکلیف کا آنا پسند نہ کرے۔

ان کے جذبۂ جہاد اور ذوق شوق شہادت کا یہ عالم تھا کہ ایک سپاہی بخار کی وجہ سے بہت کمزور ہو رہا تھا اس لئے سید صاحب نے اسے جنگ کے لئے منتخب نہ کیا تو وہ بیتابانہ سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ

حضرت! میں کچھ ایسا بیمار تو نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو اور یہ پہلا محاربہ ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی میرا نام ضرور شامل فرما لیجئے۔ تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

چنانچہ وہ مرد مجاہد میدان جنگ میں گیا اور لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا ان کی مشکلات کا یہ عالم تھا کہ انھیں

اکثر فاقے کرنے پڑتے یا مجاہدین ساگ پات کھا کر گذارہ کر لیتے کبھی کبھی روزانہ مٹھی بھر جوار ملنے لگی تندرست غازی اسے پیس کر روٹی پکا لیتے۔ بیمار اس کے دانے پانی میں ابال کر آش سی بنا لیتے۔ جب جوار بھی نہ ملتی تو باہر نکل جاتے اور جنگل میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے یا ان درختوں کے پتے توڑ لاتے جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوتے اور پانی میں جوش دینے سے گل جاتے، انہی میں نمک ڈال کر کھا لیتے۔

تنگ دستی کا یہ عالم تھا لیکن اس کے باوجود

سواروں کو بستی میں جانے یا کوئی چیز مانگنے کی سخت ممانعت تھی۔ ایک مرتبہ ایک سپاہی نے ایک گاؤں میں کسی سے چھاچھ مانگ لی رسالدار سخت ناراض ہوئے۔ گاؤں والوں نے کہا کہ یہ معمولی بات ہے لیکن رسالدار نے سپاہی سے صاف صاف کہدیا کہ ہمارے ساتھ رہنا منظور ہے تو ضابطوں کی پابندی کرنا ہوگی۔ ورنہ آپ امیر المومنین کے پاس چلے جائیے۔

جب کہ ان کے نمک کے معاملہ میں ایسی احتیاط برتی جاتی تھی تو فریب دہی کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک شخص عبدالغفار خاں نامی تھا۔ اسے قلب سازی میں کمال حاصل تھا۔ کہتا تھا کہ جتنے روپے چاہیئں بنا کر دے سکتا ہوں۔ اور ان سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ سید صاحب نے صاف صاف فرما دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو قلب سازی چھوڑ دو۔ ورنہ سکھوں کے علاقہ میں چلے جاؤ؛

یہ تھی مجاہدین کی وہ جماعت جنھیں خود مسلمانوں کی مخالفت اور مولوی صاحبان کے فتووں نے اس طرح ختم کر دیا کہ پھر ان کے بعد ایسی کوئی تحریک پیدا نہ ہو سکی۔ ہمارے زمانہ میں اللہ کے ان فرمانبردار بندوں کی زندگی کے واقعات کا مطالعہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ اقامتِ دین کے لئے صالحین کی جس جماعت کا اٹھنا ضروری ہے اس کے عزم و ایمان اور سیرت و کردار کے خد و خال کس قسم کے ہوتے ہیں۔ مہر صاحب کو سید صاحب سے جو والہانہ عقیدت اور ان کی تحریک سے جو انتہائی شیفتگی ہے اس سے مستبعد نہیں تھا کہ حقائق نگاری پر جذبات غالب آجاتے۔ لیکن مہر صاحب کی

بے قراری ہے کس قرار کے ساتھ

اور انھیں کس حد تک

جبر ہے دل پہ اختیار کے ساتھ

اس کا اندازہ اس سے لگ سکتا ہے کہ انھوں نے ساری کتاب میں کہیں بھی اپنی مورخانہ ذمہ داری کو نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ ذالک من عزم الامور۔ ہم اس سلسلہ کی اگلی کڑی کے لئے ہمہ تن شوق ہیں جس میں وعدہ کیا گیا ہے کہ یہ بتایا جائے گا کہ اس جماعت نے سید صاحب کی شہادت کے بعد ہندوستان کے اندر اور باہر اسلام اور اسلامیت کے احیاء کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں کیں۔

۲۔ قطعات سائز ۲۰×۱۵ ادارۂ شعرائے مشرق کے نام سے کارخانۂ تجارت کتب آرام باغ کراچی نے خوشخط قطعات کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ زیر نظر قطعہ علامہ اقبال کے ان دو شعروں پر مشتمل ہے

یہی مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی — اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

یہ قطعہ مشہور خوشنویس عبدالمجید صاحب دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ عمدہ آرٹ پیپر پر چار رنگ میں چھپا ہے۔ خوشنما اور دیدہ زیب ہے۔ قیمت ایک روپیہ محصول ڈاک ۸/

پلاننگ بورڈ کی مجوزہ زرعی اصلاحات

جولائی سنہ ۱۹۵۵ء کے طلوعِ اسلام میں اس پانچ سالہ منصوبہ (پلان) پر جو حکومت پاکستان کے پلاننگ بورڈ کی طرف سے شائع ہوا ہے ہمارا تبصرہ قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ اُس وقت (جیسا کہ اُس تبصرہ میں بتایا گیا تھا) اس پلان کے موٹے موٹے خطوط (OUTLINES) کا مسودہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اصل پلان کا مسودہ دو ضخیم جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں ہمارے نزدیک (اور خود پلان کے مرتبین کے نزدیک) ہمارے ملک میں زمین کا مسئلہ بہت اہم ہے۔ اس لئے ہم اس پلان کے اس حصے کے متعلق ذرا تفصیلی گفتگو ضروری سمجھتے ہیں جس کا تعلق زرعی اصلاحات سے ہے۔ پلان کی دوسری جلد کا سولہواں باب اس موضوع پر مشتمل ہے۔ اور وہی اس وقت ہمارے زیرِ نظر ہے۔

مذکورہ صدر باب کی تمہید میں پہلے زمینداری کے تاریخی پس منظر کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ پاکستان میں اس سلسلہ میں اس سے پہلے کون کون سے اصلاحی قدم اٹھائے گئے۔ اور زمینوں کی ملکیت کے بارے میں ملک کی اس وقت کیا حالت ہے۔ پھر یہ بتایا گیا ہے کہ دنیا کے دوسرے ممالک میں زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں اس وقت تک کیا کچھ کیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد پلاننگ بورڈ نے اپنی تجاویز پیش کی ہیں یعنی یہ بتایا ہے کہ ان کے نزدیک اس باب میں پاکستان میں کیا کچھ کرنا چاہیئے۔ یہ وہ حصہ ہے جو ہمارے نزدیک اہلِ پاکستان کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔ ہم اس حصہ کے مختلف (اہم) ٹکڑوں کا آزاد ترجمہ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد ان تجاویز کے متعلق اپنا تبصرہ پیش کریں گے۔ (ہمارے نزدیک ضرورت اس کی تھی کہ اس رپورٹ کے سولہویں باب کا مختلف زبانوں (سندھی۔ بنگالی۔ اردو۔ پشتو) میں ترجمہ پمفلٹوں کی شکل میں حکومت کی طرف سے شائع ہوتا اور اس کی کثرت سے اشاعت کی جاتی۔ تاکہ جو عوام ان اصلاحات سے براہِ راست متعلق ہیں۔ انہیں علم ہو جاتا کہ پلان کی تجاویز کیا ہیں اور حکومت اس باب میں کیا کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال ان تجاویز کے اہم حصوں کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

پیرا ۲۳۔ زرعی اصلاحات کے سلسلہ میں اس وقت بڑی انقلابی تجاویز مشرقی پاکستان کی مجلسِ مقننہ کے زیرِ غور ہیں۔ اگرچہ ان پر ابھی عملدرآمد نہیں ہوا۔ ان تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ زمینداری (LANDLORDSHIP) کو بالکلیہ ختم کر دیا جائے۔ اور کاشت کاروں کو ملکیت اور مستقل اراضی کے پٹے پٹے اختیارات دیدیئے جائیں۔ ہندوستان (بھارت) کی زرعی اصلاحات کی اسکیم کا رخ بھی اسی سمت ہے۔ لیکن ہم اس کے حق میں نہیں ہیں کہ مغربی پاکستان میں زمینداری کو ختم کر دینے کا

سا انقلابی قدم اٹھایا جائے۔ اس سے کھنچاؤ اور تناؤ کے علاوہ معاشرہ میں عدم استواری اور اس قسم کی دوسری بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔ ذاتی (پرائیویٹ) ملکیت ہمارے معاشرہ کی ایک معروف اور مسلّمہ منہاج (RECOGNISED INSTITUTION) ہے اس سے وہ اقتدار وابستہ ہیں جو انفرادی اور معاشرتی نشوونما میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ بہتر ہوگا کہ زمین کی انفرادی ملکیت کو محدود کر دیا جائے۔ اس باب میں ہم مسلم لیگ کی زرعی اصلاحات کی کمیٹی سے متفق ہیں۔ جس نے سفارش کی تھی کہ

(۱) نہری (آب پاش) زمین کی انفرادی ملکیت کی حد زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو ایکڑ ہو۔

(۲) چاہی (نیم آب پاش) زمین کی حد تین سو ایکڑ اور

(۳) بارانی کی حد ساڑھے چار سو ایکڑ۔

جس کے پاس اس سے زائد زمین ہو۔ وہ اسے حکومت کو دیدے۔ اس میں حسب ذیل مستثنیات (EXCEPTIONS) ہونگی

(ا) باغات

(ب) ایسی زمینداریاں (ESTATES) جو اس وقت مشینوں کے ذریعے سے زیر کاشت ہیں۔

(ج) ایسی زمینیں جو زراعتی کالجوں یا یونیورسٹیوں کے پاس ریسرچ کی غرض سے ہیں۔

(د) جو زمینیں رفاہ عامہ کے اداروں کے پاس ہیں۔ اور ان سے ان کی اپنی ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ یعنی وہ اس کی پیداوار کو فروخت نہیں کرتے۔

پیرا ۵۳:۔ سابقہ پیرا میں ذاتی ملکیت کے لئے جو حد بندی تجویز کی گئی ہے۔ اس میں سے زیادہ سے زیادہ حسب ذیل مقدار کی اراضی خود کاشت کے لئے رکھی جاسکے گی۔ باقی اراضی مزارعین کاشت کریں گے۔

(۱) نہری اراضی ۔ ۱۲۵ ایکڑ

(۲) چاہی اراضی ۱۵۰ ایکڑ

(۳) بارانی ۱۷۵ ایکڑ

(۴) جہاں مشینوں سے کاشت کی جاتی ہے وہاں ذاتی ملکیت کی تمام کی تمام اراضی خود کاشت کے لئے رکھی جائیگی۔

پیراء ۵۹ میں کہا گیا ہے کہ "خود کاشت" میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو تمام کی تمام اراضی کو خود ہی کاشت کریں (یعنی ایک خاندان کے افراد۔ باپ، اور اس کے بیٹے وغیرہ مل کر کاشت کریں) اور وہ بھی جو حسب الضرورت مزارعین (یا مزدوروں) کو ملازم رکھ لیں۔

پیراء ۶۰ میں کہا گیا ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن کی رو سے لوگ زیادہ سے زیادہ قطعات اراضی کو "خود کاشت" کا نقاب نہ اڑھا سکیں۔ بلکہ ان کے پاس خود کاشت رقبہ اتنا ہی ہے جتنے رقبہ کو وہ فی الواقعہ خود کاشت کریں۔

پیراء ۶۲ میں اس سوال کو اٹھایا گیا ہے کہ ایک شخص کے مرنے کے بعد جب زمین اس کے وارثوں میں تقسیم ہوتی ہے

تو ایک دو نسلوں کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ایک شخص چند گز زمین کے ٹکڑے کا مالک رہ جاتا ہے۔ اس کے لئے تجویز کیا گیا ہے کہ ایسا قانون بنا دیا جائے جس کی رو سے ایک خاص مقدار کا رقبہ مزید وارثوں میں تقسیم نہ ہو سکے۔ اس ضمن میں کہا گیا ہے کہ

"اس قسم کے قانون کے خلاف یہ اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ یہ چیز شریعت اسلامی کے قانونِ وراثت کے خلاف ہے جس کی رو سے ہر وارث کو اس کا حصہ ملنا ضروری ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو۔ اس باب میں ہم ملی مفاد کے پیش نظر تجویز کرینگے کہ مغربی پاکستان میں بھی وہی کچھ کیا جائے جو مشرقی پاکستان میں کیا گیا ہے۔ یا جو دوسرے اسلامی ممالک مثل مصر اور سوڈان میں کیا جا رہا ہے:

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ مذکورہ صدر ممالک میں اس رقبہ میں کم از کم مقدار کیا رکھی ہے جو مزید تقسیم نہیں ہو سکتا۔ اس ضمن میں پیرا ع۶۷ میں کہا گیا ہے کہ

"اسلامی شریعت نے ہمیشہ اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ مفادِ عامہ کے لئے لوگوں کی ذاتی املاک کو ان سے لیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس قسم کا اعتراض کبھی کسی نے نہیں اٹھایا کہ زمین یا کسی اور غیر منقولہ جائداد کو مفادِ عامہ کے لئے حاصل کرنا دیگر قوانین شریعت سے متصادم ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک ملک کی پیداوار کو برقرار رکھنے سے زیادہ مفادِ عامہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس پر تو لوگوں کی زندگی کا دار و مدار ہے۔ اس لئے ہماری سفارش یہ ہے کہ اگر کسی کے حصہ میں ایک خاص مقدار سے کم رقبۂ اراضی آتا ہو تو حکومت اس رقبہ کو خود لے لے۔ اور اسے کسی دوسرے ضرورتمند کے رقبہ کے ساتھ شامل کر دے"۔

پیرا ع۵۵ "زمینداروں سے جو فاضل زمین حاصل کی جائے۔ اس کے معاوضہ کے متعلق مسلم لیگ کی زرعی اصلاحات کی کمیٹی نے کہا تھا کہ اگرچہ ہم اصولاً ایسے معاوضہ کے حق میں ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کا بھی اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ایسے معاوضہ کے اخلاقی حق کے متعلق کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے خلاف کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے بعد اس کمیٹی نے کہا تھا کہ "پاکستان میں زمینداری ایک ایسا تاریخی حادثہ ہے جس کی رو سے زمینداروں کی نسلیں ان زمینوں سے فائدے اٹھاتی چلی آ رہی ہیں۔ اس لئے ان کے حق ملکیت کو معاوضہ کے لئے وجۂ جواز قرار دینا بجز معقول ہوگا"۔

پیرا ع۵۶ جہاں تک بڑی بڑی زمینداریوں کا تعلق ہے جب ان کی بابت تحقیق کی جائے گی تو ان پر حق ملکیت بمشکل ثابت ہو سکیگا۔ ان کے متعلق منکشف ہوگا کہ یا تو انہیں ناجائز طریقوں سے حاصل کیا گیا تھا اور یا انہیں حکومتِ برطانیہ نے ان خدمات کے صلہ میں عطا فرمایا تھا جو ان لوگوں نے ہندوستان میں انگریز حکمرانوں کے قدم جمانے کے سلسلہ میں سرانجام دی تھیں باقی رہے جذباتِ ہمدردی۔ سو ان کی بنا پر بھی معاوضہ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ڈیڑھ سو ایکڑ نہری زمین جو ایک فرد کے قبضہ میں رہنے دی جائے گی اتنی کم نہیں کہ اس کی آمدنی سے اس کے خاندان کی ضروریات پوری نہ ہو سکیں۔ بشرطیکہ وہ اس زمین کا خاطر خواہ انتظام کرلیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اور بھی قیمتی اثاثہ ہوگا جو اکثر اوقات ان کی ضروریات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

پیرا ع۵۷ بھارت میں معاوضہ کی شرح اکرایہ اراضی کے مطابق تجویز کی گئی ہے۔ مدھیا پردیش میں بحساب تین روپیہ

فی ایکڑ، مدراس میں نو روپیہ۔ اتر پردیش میں ستائیس روپیہ فی ایکڑ اور بہار میں اڑتیس روپیہ فی ایکڑ۔ برائیں مالیہ کے لحاظ سے شرح معاوضہ تجویز کی گئی ہے۔ یعنی زیادہ سے زیادہ بارہ گنا۔ پاکستان میں کم و بیش اسی شرح سے معاوضہ دیا جائے تو مناسب ہوگا۔

یہ ہیں پلاننگ بورڈ کی بڑی بڑی سفارشات۔ اس ضمن میں ہم سب سے پہلے ایک بات اصولاً بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب ہم اپنے مسائل کا حل دریافت کرنے کے لئے بیٹھیں تو کیا ہمیں بھی وہی انداز و طریق اختیار کرنا چاہیے جو دنیا کی دوسری قومیں اپنے ہاں اختیار کرتی ہیں۔ یا ہم میں اور ان میں کوئی فرق ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہم میں اور ان میں ایک بنیادی فرق ہے۔ وہ اپنے مسائل کا حل خالص سیکولر انداز سے اپنے مصالح کے پیش نظر دریافت کریں گے۔ لیکن ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ مسئلہ زیر غور کے متعلق خدا کی راہ نمائی کیا کہتی ہے۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے (اور اس ایمان کو ہم نے اپنی مملکت کے آئین میں بھی داخل کر لیا ہے) کہ ہمیں فضا کی پہنائیوں میں بے محابا اذنِ پرواز نہیں۔ بلکہ ہمارا رشتہ ایک خاص مرکز سے بندھا ہوا ہے۔ اور ہم کسی حالت میں بھی اس مرکز سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مثلاً اگر امریکہ کے زیر غور یہ سوال ہو کہ ان کے ہاں شراب کی ممانعت کر دی جائے یا نہ۔ تو ان کا انداز یہ ہوگا کہ وہ ڈاکٹروں سے پوچھیں گے کہ شراب کا صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اس کے بند کر دینے سے کسی قسم کی خرابی تو نہیں ہوگی۔ وہ محکمہ آبکاری سے پوچھیں گے کہ اس سے ملک کی درآمد و برآمد کس طرح متاثر ہوگی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد وہ دیکھیں گے کہ آراء کا پلڑا بندش کی طرف جھکتا ہے یا کشادگی کی طرف۔ لیکن جب یہی سوال ہمارے سامنے آئے گا تو ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس باب میں ہمارے خدا کا کیا حکم ہے۔ اور جب ہم دیکھیں گے کہ خدا کا حکم اس کے بند کر دینے کے لئے ہے تو ہمارے لئے غور طلب مسئلہ صرف یہ رہ جائے گا کہ ہمیں بحالات موجودہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے کیا کرنا چاہیے۔ بتدریج وہاں تک پہنچنا چاہیے یا ایک ہی جست میں۔ نیز ہمارے فیصلے سے اگر کسی ضمن میں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو اسے پورا کرنے کے لئے ہمیں کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ پلاننگ بورڈ کو یہی روش زمین کے مسئلہ کے حل کے لئے بھی اختیار کرنی چاہیے تھی۔ یعنی اسے بنیادی طور پر یہ دیکھنا چاہیے تھا کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ اور پھر اس کی روشنی میں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے یہ روش اختیار نہیں کی۔ ان کی رپورٹ میں چین۔ جاپان۔ امریکہ۔ افریقہ وغیرہ کے نظائر و امثال تو ہیں۔ لیکن قرآن کا کسی جگہ بھی ذکر نہیں آتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ بورڈ کے ممبر اتنی استعداد نہیں رکھتے تھے کہ قرآن سے راہ نمائی لے سکتے۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب انہوں نے دنیا کے گوشے گوشے سے مختلف نوعیتوں کی اطلاعات اکٹھی کرنے کی کوشش کی، تو قرآن کے متعلق اتنی سی معلومات حاصل کرنے میں کون سی مشکل تھی؟ انہیں خود معلوم نہیں تھا تو جاننے والوں سے پوچھا جا سکتا تھا! قرآن سے راہ نمائی حاصل کرنے کے بعد منزل کے تعین میں کوئی دشواری نہیں رہتی۔ اور بورڈ کا کام فقط اتنا رہ جاتا کہ اس منزل تک پہنچنے کے لئے پلان تجویز کر لیا جائے (ہم اتنا لکھ چکے تھے کہ ہمارے سامنے پلاننگ بورڈ کی طرف سے شائع کردہ ایک اخباری بیان نظر سے گذرا۔ اس میں انہوں نے لکھا ہے کہ ہم اپنی سفارشات میں اسلامی رنگ (BOAS) نہیں لائے۔ اس کے لئے ہم نے تجویز کیا ہے کہ ملک میں اسلامک ریسرچ کے ادارے

قائم کئے جائیں۔ وہ ادارے اس قسم کی تحقیق کریں کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے۔ اور اس نظام کو موجودہ زمانے کے تقاضوں سے کس طرح ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ ادارے اپنی تحقیق مکمل کرلیں گے تو پھر اس قسم کی اسکیموں کو اسلامی بنیادوں پر استوار کیا جاسکے گا۔

یہ جذبہ بڑا مبارک ہے۔ لیکن جہاں تک اس کے عملی نتیجہ کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ

تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود

پلان کا سودہ حقیقت کی شکل اختیار کرے گا۔ پھر اسے حکومت کی منظوری حاصل ہوگی۔ پھر اس کے ماتحت ریسرچ کے ادارے کھولے جائیں گے۔ پھر وہ ادارے تحقیقات شروع کریں گے۔ اور جب وہ تحقیق مکمل ہوگی تو پھر سوچا جائے گا کہ ان تجاویز کو اسلامی رنگ کیسے دیا جائے! ٹھیک کہا تھا غالبؔ نے کہ

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

ان حضرات سے کون عرض کرے کہ قرآن کوئی ایسی گپت وِدیا نہیں، جس سے اس قسم کے سوالات کا اصولی جواب لینے کے لئے اس قسم کے دور دراز راستوں کو طے کرنا پڑے۔ قرآن سے ان امور کا جواب تھوڑی سی کوشش سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کی رُو سے زمین، ارزاق کا سرچشمہ ہے۔ اور (ہوا۔ پانی۔ روشنی) کی طرح رزق (سامانِ زیست) کے سرچشموں پر کسی کی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تمام ضرورت مندوں کے لئے یکساں طور پر کھلے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ارض (زمین) کے متعلق صاف الفاظ میں کہدیا کہ یہ سَوَاءً لِّلسَّائِلِينَ (۴۱/۱۰) رہے گی۔ یعنی تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں۔ اس لئے کہ اسے مَتَاعًا لِّلْمُقْوِينَ (۵۶/۷۳) بھوکوں کے لئے سامانِ حیات بنایا گیا ہے۔ اس باب میں ہم اتنا کچھ لکھ چکے ہیں کہ اس وقت اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ قرآن کی اس واضح راہ نمائی کے بعد سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ زمین کا انتظام کس انداز سے کیا جائے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو اور وہ پیداوار ضرورت مندوں کے کام آسکے۔ اس طرح کہ اس خطۂ زمین میں کوئی متنفس بھوکا نہ رہنے پائے۔

اب آیئے بورڈ کی سفارشات کی طرف۔ بورڈ کو خود یہ تسلیم ہے کہ یہ نظام جس کی رو سے ایک شخص زمین کے رقبہ کا مالک بن کے گھر میں بیٹھ رہتا ہے۔ اور مزارعین محنت شاقہ سے اس کے عیش و عشرت کا سامان بہم پہنچاتے ہیں بالکل باطل ہے۔ اور دنیا اب اس سے کہیں بچھڑانی چلی جارہی ہے۔ لیکن اس اصول کو تسلیم کرنے کے باوجود بورڈ اس قسم کی سفارشات کرتا ہے۔ جن سے یہ باطل نظام مٹتا نہیں بلکہ قائم رہتا ہے مثلاً

(۱) بورڈ کے نزدیک ایک خاندان کی خود کاشت کے لئے پچیس ایکڑ (نہری) زمین کافی ہوگی۔ لیکن وہ اس خاندان کے لئے ڈیڑھ سو ایکڑ (نہری) زمین کی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے کم از کم سوا سو ایکڑ زمین پر زمینداری نظام بدستور

قائم رہے گا۔ خود بورڈ کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق (سابقہ) پنجاب میں ایسے زمینداروں کا تناسب آبادی جن کے پاس سو ایکڑ سے زیادہ زمین تھی (۶ء۵) اعشاریہ چھ سے زیادہ نہیں تھا۔ یعنی قریب اڑھائی فیصدی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جن زمینداروں کو فاضل زمینیں واگذار کرنی ہوں گی۔ ان کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ

(۲) بورڈ نے اپنی تحدیدی سفارش سے "باغات کو بھی مستثنےٰ قرار دیدیا ہے۔ اور ان بڑی بڑی زمینداریوں کو بھی جن میں مشینوں کے ذریعہ کاشت ہوتی ہے کسے معلوم نہیں کہ جب مسلم لیگ کی زرعی اصلاحات کمیٹی نے اپنی سفارشات پیش کی تھیں تو بڑے بڑے زمینداروں نے اپنے بیشتر رقبات کو باغات میں تبدیل کر لیا تھا۔ باقی رہی مشینوں کے ذریعہ کاشت۔ سو آج کون سا بڑا زمیندار ہے جس کے پاس ٹریکٹر وغیرہ نہیں؟ لہٰذا بورڈ کی سفارشات میں بڑے بڑے زمینداروں کے تحفظ کا سامان بدستور موجود ہے اس کی زد میں صرف متوسط طبقہ آ سکے گا۔ حتیٰ کہ ڈیڑھ سو ایکڑ (نہری) زمین کے مالک بھی اپنے پورے رقبہ میں نظام زمینداری کو برقرار رکھ سکیں گے۔ کیونکہ ان کے لئے یہ کہا گیا ہے کہ اگر ان کے رقبہ میں مشینوں کے ذریعہ کاشت ہوگی تو سارے کا سارا رقبہ خود کاشت متصور ہوگا۔ اور انہیں ان میں سے کچھ رقبہ بھی مزارعین کو دینا نہیں پڑے گا۔

بورڈ نے کہا ہے کہ مشرقی پاکستان میں نظام زمینداری کو ختم کیا جا رہا ہے۔ اور ہندوستان میں بھی ہوا کا رخ ادھر ہی کو ہے۔ لیکن مغربی پاکستان میں اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں؟ اس کے لئے بورڈ صرف یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا ہے کہ اس سے بہت سی مشکلات پیدا ہو جائیں گی اور کشمکش بڑھ جائے گی۔ ہمیں حیرت ہے ایسے اہم معاملہ میں بورڈ نے صرف اتنا کہہ دینے کو کس طرح محکم دلیل تصور کر لیا۔؟ سوال یہ ہے کہ جو نظام مشرقی پاکستان میں قابل عمل ہو سکتا ہے۔ وہ مغربی پاکستان میں ایسا کیوں نہیں ہو سکتا؟ اگر بورڈ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ بعض خاص وجوہ کی بناء پر ایسا نہیں ہو سکتا تو اسے چاہیئے تھا کہ ان وجوہات کو بہ تفصیل بیان کرتا۔ یہ دلیل تو بڑی عمومی اور سطحی ہے کہ اس سے مشکلات اور پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں گی۔

خود کاشت کے ضمن میں بھی بورڈ نے جو تجویز کیا ہے کہ جس رقبہ کو زمیندار، مزدوروں کے ہاتھوں کاشت کرائیں گے اسے بھی خود کاشت سمجھا جائے گا۔ اسے مناسب شرائط کے ساتھ مشروط کرنا چاہیئے تھا۔ مثلاً ایک شخص اپنے تین چار بیٹوں کے ساتھ مل کر پچیس ایکڑ زمین خود کاشت کرتا ہے۔ بدقسمتی سے اس کے لڑکے مر جاتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ جاتے ہیں۔ اس صورت میں اگر یہ شخص مزدوروں کو اپنے ساتھ رکھ لیتا ہے تو یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اس کے بیٹے مختلف کاروبار کرتے ہیں اور وہ مزدوروں کو ملازم رکھ کر کاشت کرتا ہے تو اسے جائز قرار نہیں دیا جانا چاہیئے۔ یعنی اصول یہ پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ کسی شخص کی جائز ضرورت کیا ہے اور یہ کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی انسان صرف اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ ایک شخص کے مرنے کے بعد زمین چھوٹے چھوٹے رقبوں میں بٹ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض اوقات ایک قطعہ چند گز سے زیادہ کا نہیں رہتا۔ بورڈ نے حقائق کو سامنے رکھ کر کوئی تجویز پیش نہیں کی۔ سب سے پہلے اس مسئلہ کے معاشی پہلو کو لیجئے۔ ایک شخص کے پاس ۲۵ ایکڑ خود کاشت زمین ہے اس کے تین چار بیٹے ہیں۔ یہ رقبہ اس خاندان کی ضروریات زندگی

پورا کرنے کے لئے کافی ہے۔ بیٹے بڑے ہو کر خود صاحب اولاد ہو جاتے ہیں۔ اور ایک ایک کے گھر تین تین چار چار بچے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ ۲۵ ایکڑ کا ٹکڑہ اتنے خاندانوں کی کفالت کے لئے کافی نہیں ہو سکتا۔ حکومت کو چاہیئے کہ ان کے لئے الگ الگ قطعات اراضی مہیا کرے۔ اگر حکومت ایسا نہیں کرے گی تو ہر خاندان کے پاس چھ چھ ایکڑ زمین رہے گی جس میں ظاہر ہے کہ کسی کا بھی گذارہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا سوال صرف یہی نہیں کہ اس طرح قطعات اراضی مختصر ہوتے جائیں گے بلکہ اس سے بھی اہم سوال یہ ہے کہ ان خاندانوں کی پرورش کا ذریعہ کم سے کم تر ہوتا جائے گا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اب تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے لیکن جو کچھ اب ہو رہا ہے اس کا نتیجہ ملک کی وہ بدحالی اور تباہی ہے جس کی اصلاح کے لئے بورڈ کو پلان مرتب کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اگر ان کوششوں کے بعد بھی ملک کی معاشی حالت ویسی کی ویسی رہی تو اس تمام ادھیڑبن سے حاصل کیا ہوا؟ یاد رکھیئے۔ جب تک ہم قرآن کے بنیادی نقاط کو سامنے نہیں رکھیں گے۔ ہماری بہبودی اور خوشحالی کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکے گی۔ وہ بنیادی نقاط یہ ہیں کہ

(۱) مملکت میں بسنے والے تمام افراد کے رزق کی ذمہ داری مملکت پر ہے اور

(۲) ذرائع رزق پر انفرادی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ معاشرہ ان کا ایسا انتظام کرے گا جس سے وہ تمام افراد کی ضروریات پورا کرنے کے کفیل ہو سکیں۔

اگر ان بنیادی نقاط کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ سوالات پیدا ہی نہیں ہوتے جنہوں نے ملک (اور بورڈ) کو اس قدر پریشان کر رکھا ہے۔ اور جن کا کوئی خاطر خواہ حل بورڈ کی سمجھ میں نہیں آرہا۔ مملکت کا فریضہ ہے کہ سب افراد مملکت کے لئے کام مہیا کرے۔ ان میں سے جن کے لئے کاشتکاری کا کام تجویز کیا جائے انہیں مناسب اراضی دی جائے۔ باقیوں کے لئے دوسرے کام تجویز کئے جائیں۔

اب رہا یہ سوال کہ شریعت اسلامی کی رو سے زمین کی تقسیم وراثت کے حصوں کے مطابق ہوتی ہے تو اس باب میں بھی بورڈ اس لئے غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس کے سامنے قرآن کا قانون وراثت نہیں۔ سب سے پہلے تو یہ کہ جب زمین کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو وراثت میں اس کی تقسیم کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اگر اسے تسلیم بھی کر لیا جائے کہ (کم از کم عبوری دور کے لئے) اس پر قانون وراثت وارد ہوگا تو قرآنی قانون وراثت کے مطابق ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پوری کی پوری جائداد کے متعلق وصیت کر دے۔ قرآن کے متعین کردہ حصوں کے مطابق تقسیم صرف اس صورت میں ہوگی جب کوئی چیز وصیت سے باقی بچ جائے اس صورت میں اس شخص کو جس کے پاس (مثلاً) ۲۵ ایکڑ زمین ہے یہ چاہیئے کہ اپنے دو تین بیٹوں کو مناسب تعلیم دلا کر برسر روزگار کردے اور ایک آدھ بیٹے کو کاشتکاری کے لئے رکھے۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کی زمین (اس کی وصیت کے مطابق) اسی بیٹے کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ ہم نے یہ چیز محض بطور مثال بیان کی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس طرح بہت سی مشکلات کا حل نکل سکتا ہے۔

جہاں تک زمینوں کے معاوضہ کا تعلق ہے۔ بورڈ کی تجویز عجیب سی نظر آتی ہے۔ ایک طرف وہ یہ کہتے ہیں کہ بڑی بڑی زمینداریوں میں حق ملکیت کا اثبات ہی مشکل ہوگا۔ وہ یا تو ناجائز طریقوں سے حاصل کردہ ہیں۔ اور یا انگریزوں کی طرف سے غداریٔ ملک کے صلہ میں عطا کردہ انعام۔ لیکن اس کے بعد بورڈ خود ہی تجویز کرتا ہے کہ انہیں فلاں شرح کے حساب سے معاوضہ دیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ زمین پر موجودہ زمینداروں کی ملکیت کے اصول کو آپ تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر آپ کے نزدیک یہ اصول مسلّم ہے تو پھر ان زمینوں کا معاوضہ بھی دینا ہوگا۔ اور اگر آپ کو سرے سے یہ اصول ہی تسلیم نہیں تو پھر معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین پر افراد کے حق ملکیت کو تو آپ اس بنا پر بھی تسلیم کر رہے ہیں کہ آپ کی تجویز کے مطابق جدید کاشتکاروں کو زمین قیمتاً دی جائے گی۔ ہم حکومت سے درخواست کریں گے کہ وہ اس مسئلہ پر خاص طور پر غور کرے۔ جو کچھ پیچھے ہو چکا ہے اسے چھوڑیئے آئندہ کے لئے تو ایسی روش اختیار نہ کیجئے جس سے پھر وہی مشکلات پیدا ہو جائیں جن کے حل کے لئے اب اس قدر تگ و تاز کی جا رہی ہے۔ دریاؤں کے پانی کی طرح زمین بھی کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہنی چاہیئے۔ یہی ان تمام مشکلات کا حل ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اہم کڑی ایسی ہے جس کے متعلق بورڈ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ یہ کہ کاشتکاروں کو اپنی زمین میں کاشت کیا کرنا چاہیئے۔ آپ اٹک سے پارشیلوا تک چلے جایئے۔ یہ خطۂ اراضی بڑا زرخیز ہے۔ کبھی اس سے خوراک کے ذخیروں کے ذخیرے حاصل ہوتے تھے۔ لیکن اب اس زمین میں یہاں سے وہاں تک جدھر دیکھئے تمباکو ہی تمباکو دکھائی دیتا ہے آپ سوچئے کہ جس ملک کی حالت یہ ہو کہ اسے ہر سال کروڑوں روپے کا غلہ باہر سے منگانا پڑے۔ وہ اپنی اعلیٰ درجہ کی زمینوں کو تمباکو کے لئے وقف کر دے تو اس سے بڑھ کر اس ملک کی اور بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے۔ اگر اس حقیقت سے صرفِ نظر بھی کر لیا جائے کہ تمباکو نوشی سے صحت کو کس قدر نقصان پہنچتا ہے تو کم از کم اتنا تو ہر ایک کو تسلیم ہے کہ تمباکو کے بغیر انسان مرتا نہیں۔ لیکن غلہ بہم نہ پہنچنے سے لاکھوں قیمتی جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا جس ملک میں غلہ کی قلت ہو اس کی زمینوں میں تمباکو کاشت کرنے کی اجازت دینا اپنے ہاتھوں اپنا گلا کاٹنا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کیفیت یہ ہے کہ حکومت اس کی صرف اجازت ہی نہیں دیتی بلکہ کہا جاتا ہے کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اس لئے کہ حکومت کو تمباکو سے ایکسائز ڈیوٹی ملتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ صورت حالات بڑی ہی تاسف انگیز ہے۔ بہرحال حالت یہ ہو یا نہ ہو یہ امر واقعہ ہے کہ ملک کی مزروعہ اراضی کا اس قدر قیمتی حصہ تمباکو بونے کے لئے وقف ہے۔ اور غلہ کے لئے ہم دوسروں کے محتاج ہو رہے ہیں۔ اس حد تک محتاج کہ (ٹائمز آف کراچی مورخہ ۸ اگست میں شائع شدہ رپورٹ کے مطابق) سال مختتمہ جون ۱۹۵۶ء میں ہمیں امریکہ سے اسی کروڑ روپے کی امداد ملی۔ اس میں سے چونتیس کروڑ روپیہ غلہ کی درآمد کی نذر ہوگیا۔ لیکن ہم اتنا بھی نہیں کرتے کہ جن زمینوں میں تمباکو بویا جاتا ہے کم از کم انہیں ہی گیہوں کے لئے مختص کرلیں۔ غالباً اسی قسم کے اقدامات ہیں جن کے متعلق امریکہ کے ڈائرکٹر آف انٹرنیشنل کوآپریشن (مسٹر ل ہ) نے کہا ہے کہ

حکومت پاکستان نے غذائی پیداوار کے معاملہ میں ابھی تک کوئی موثر اقدامات نہیں کئے حالانکہ یہ اقدامات ان کی دسترس کے اندر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت نے اپنی نیا فیوں میں تو ہمارے لئے کوئی کمی نہیں کی۔ ہم خود ہی ہاتھ نہ بڑھائیں تو اس کا کیا علاج ؟

ہم نے اپنے سابقہ تبصرہ میں یہ بھی کہا تھا کہ بورڈ نے ایک طرف زمینداری کو ختم کرنے کے سلسلہ میں اتنا کچھ کہا ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ انفرادی کارخانہ داری کو فروغ دینے کی تجاویز پیش کر رہا ہے۔ حالانکہ جس طرح زمین پر انفرادی ملکیت ہزار خرابیوں کی جڑ ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے کارخانوں کی انفرادی ملکیت بھی تباہ کن نتائج کی حامل ہے۔ زمینداری اور کارخانہ داری۔ یا اسی قبیل کے حصولِ دولت کے دیگر ذرائع۔ درحقیقت علامات مرض ہیں۔ علت مرض نہیں۔ علت مرض تو نظام سرمایہ داری ہے جسے قرآن نے انسانیت کی لعنت اور جہنم کی آگ قرار دیا ہے۔ زمینداری کو ختم کرکے اس کی جگہ انفرادی کارخانہ داری کو متمکن کر دینا محض خرابی کی شکل کو بدل دینا ہے۔ خرابی کا علاج نہیں۔ اس باب میں ہمارے پلان کے مرتبین نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ وہ قابل غور ہے وہ لکھتے ہیں کہ

> اکثر یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ اگر زمین کا چند افراد کے ہاتھوں میں رہنا نامناسب ہے۔ اور ہمارے ملک کی معاشرتی پالیسی کے خلاف ہے تو حصولِ دولت کے دیگر ذرائع۔ مثلاً کارخانے۔ شہری جائدادیں۔ صنعتی حصص۔ حکومت کی ہنڈیاں یا نقدی ذخیرہ کا چند افراد کے پاس جمع ہو جانا بھی ویسا ہی نامناسب ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ زمینداری اور حصولِ دولت کے دیگر ذرائع میں نمایاں فرق ہے۔ وہ زمیندار جو اپنی زمینوں کو خود کاشت نہیں کرتے یا ان کا خود انتظام نہیں کرتے۔ یا ستثنائے چند زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے کوئی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے برعکس حصولِ دولت کے دیگر ذرائع کے مالکان عام طور پر ترقی پسند ہوتے ہیں۔ اور اپنی دولت سے بہت سے بیکار افراد کے لئے کام مہیا کرتے ہیں۔[1] وہ ایک بڑھنے والے معاشی نظام کے اہم مقصد کو پورا کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ جن "سماج دشمن" حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں ان کے باوجود یہ حضرات ملک کے ذرائع پیداوار کی نشوونما اور اس کی خوش حالی کے اضافہ میں نمایاں کام کرتے ہیں۔ ان کی ملکیتوں پر کسی قسم کی پابندی عاید کرنا ملک کی اقتصادیات کے لئے مضر ہو گا۔ ان کی دولت کے ارتکاز و اکتناز سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کا حل اور گوشوں میں تلاش کرنا چاہیئے۔ مثلاً زیادہ ٹیکس عاید اور وصول کرنا جن میں انکم ٹیکس اور

---

[1] شہری جائدادوں کے مالک۔ مختلف کمپنیوں کے حصوں کے خریدار، حکومت کی ہنڈیوں کے مالک۔ نقدی جمع رکھنے والے۔ جتنے افراد کے لئے کام مہیا کرتے ہیں اور جس بڑھنے والے معاشی نظام کے دست و بازو بنتے ہیں وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ یا للعجب۔

> موت کا ٹیکس' شامل ہیں۔ کوآپریٹو سوسائیٹز کا قیام جس سے صنعت گروں اور صارفین کے درمیان حائل ہونے والے طبقہ کا منافع کم از کم رہ جائے۔ کارخانوں کی تعمیر کے لئے لائسنسوں کی عادلانہ تقسیم اور پیشہ وروں کا ایک ایسا طبقہ تیار کرنا جو صنعت گری کے اداروں کا انتظام کر سکے۔

آپ نے غور فرمایا کہ ایک طبقہ کے ہاتھوں سے دولت کے ذخائر چھین کر، دوسرے طبقہ کے ہاتھ میں دینے کے حق میں کیسے کیسے محکم دلائل پیش کئے گئے ہیں۔ لیکن اس باب میں پلان کے مرتبین نے خواہ مخواہ کا تکلف برتا۔ اس کے حق میں دلیل ایک ہی ہے اور وہ ایسی محکم ہے کہ اسے کوئی غلامانہ ذہنیت رد نہیں کر سکتی۔ دلیل یہ ہے کہ چونکہ یورپ نے زمینداری کے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ کارخانہ داری کے نظام کو فروغ دیا ہے۔ اس لئے ہم پر بھی ایسا کرنا فرض ہے۔ "جو نیت امام کی سو نیت میری"۔ اللہ اکبر! کل کو جب یورپ نظام کارخانہ داری کو ختم کرنے کا فیصلہ کرے گا تو ہم بھی اس کی خوبیاں گنانے لگ جائیں گے۔ ان حضرات سے کون عرض کرے کہ جب بھی آپ دولت کے ذرائع چند افراد کے ہاتھوں میں دیدیں گے۔ اس سے تباہ کن نتائج پیدا ہوں گے۔ خواہ اس کی شکل زمینداری ہو یا کارخانہ داری جائیداد سازی ہو یا ذخیرہ اندوزی (قرآن کی مثال میں) جہنم میں داخل ہونے کے دروازے مختلف ہیں۔ لیکن اس کا عذاب یکساں طور پر الم انگیز ہے۔ زمینداروں کے مقابلہ میں کارخانہ دار ملک اور قوم کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ اس کا تماشہ ہم گذشتہ چند سالوں میں دیکھ چکے ہیں۔ اور ابھی تو اس فتنہ دوراں کا بچپن ہے شباب آنے پر معلوم کون کون سی قیامت اس کے قدموں سے لپٹے ملے گی۔

ہم نے زمینداری کے متعلق جو کچھ سابقہ صفحات میں کہا ہے۔ وہ اس نظام کے مطابق ہے جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ جب تک ہم اس نظام تک نہیں پہنچتے۔ اس وقت تک ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو تجویز پیش کی جا رہی ہے۔ وہ موجودہ صورت حالات سے بہتر ہے یا نہیں۔ ہمارے نزدیک زمین کے متعلق پلان میں پیش کردہ تجاویز موجودہ صورت حالات سے بہر حال بہتر ہے۔ اس لئے کہ حکومت اگر قرآنی نظام تک نہیں پہنچنا چاہتی تو کم از کم بورڈ کی موجودہ سفارشات کو ہی بلا مزید تاخیر نافذ کر دے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بڑے بڑے زمینداروں کی طرف سے ان تجاویز کی بھی مخالفت ہوگی اور وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے مذہبی پیشواؤں کے فتاویٰ بھی پیش کر دیں گے۔ جنہیں وہ اس سے پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں۔ مثلاً

> اسلام میں زمین کے بڑے بڑے ٹکڑوں کا مالک ہونا بھی جائز ہے اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کا مالک ہونا بھی جائز ہے ..... (یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کوئی شخص بڑے ٹکڑے کو کیا کرے گا (وہ) اتنے بڑے ٹکڑے کو خود کاشت نہیں کر سکتا۔ یہی صورت ہو سکتی ہے کہ وہ دوسروں کو ملازم رکھ کر کاشت کرائے۔ یا دوسرے لوگوں کو حصہ پر یا لگان پر کاشت کرنے کے لئے اپنی طرف سے زمین دے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کی رو سے یہ جائز ہے کہ انسان اپنی زمین پر خود تو کاشت کرے لیکن دوسروں سے کاشت کرا کے ان سے حصہ لے! اس کا جواب یہ ہے کہ ہاں یہ جائز ہے۔　(اسلام اور ملکیت زمین۔ از مرزا بشیر الدین محمود۔ صفحہ ۶۷-۶۸)

اس سے بھی واضح تر الفاظ میں:

اسلام کی حدود میں رہتے ہوئے ہم کسی نوع کی جائز ملکیتوں پر نہ تو تعداد یا مقدار کے لحاظ سے کوئی پابندی عاید کر سکتے ہیں اور نہ ہی ایسی من مانی قیود لگا سکتے ہیں جو شریعت کے دیئے ہوئے جائز حقوق کو عملاً سلب کر لینے والی ہوں .... جس طرح (اسلام) ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے روپے، اتنے مکان، اتنا تجارتی کاروبار، اتنا صنعتی کاروبار، یا اتنے مویشی، اتنی موٹریں، اتنی کشتیاں اور اتنی فلاں چیز اور اتنی فلاں چیز رکھ سکتے ہو۔ اسی طرح وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہتا کہ تم زیادہ سے زیادہ اتنے ایکڑ زمین کے مالک ہو سکتے ہو۔ پھر وہ جس طرح ہم سے یہ نہیں کہتا کہ تم صرف اسی تجارت یا صنعت یا دوسرے کاروبار کے مالک ہو سکتے ہو جسے تم براہِ راست خود کرو۔ اور جس طرح اس نے دنیا کے کسی دوسرے معاملے میں ہم پر یہ قید نہیں لگائی کہ تم کسی ایسے کام پر حقوق ملکیت نہیں رکھ سکتے جس کو تم اجرت یا شرکت کے طریقہ پر دوسروں کے ذریعہ سے کراتے ہو اسی طرح وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ زمین کا مالک بھی وہی ہو سکتا ہے جو اس میں خود کاشت کرے۔ اور یہ کہ اجرت یا شرکت پر کاشت کرنے والوں کو سرے سے زمین پر حقوق ملکیت حاصل ہی نہیں.... اسلام نے کسی نوع کی ملکیت پر بھی تعداد اور کمیت کے لحاظ سے کوئی حد نہیں لگائی۔ جائز ذرائع سے جائز چیزوں کی ملکیت جبکہ اس سے تعلق رکھنے والے شرعی حقوق و واجبات ادا کئے جاتے رہیں بلا حد و نہایت رکھی جا سکتی ہے۔

(مسئلہ ملکیت زمین۔ از سید ابو الاعلیٰ مودودی۔ صفحہ ۵۲ / ۷۳)

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسا دور تھا جس میں نظام سرمایہ داری نے خود ساختہ مذہب کے علمبرداروں کو اپنی سپر بنا کر آگے نہیں کیا؟ یہی ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اور یہی آج ہو رہا ہے۔ لیکن باطل کا نظام اس قسم کے سہاروں پر نہ کبھی قائم رہا ہے نہ اب رہ سکتا ہے۔ زمانے کے تقاضے انسان کو مار مار کر دینِ خداوندی کے قریب لاتے چلے جا رہے ہیں۔ خود پلاننگ بورڈ نے جو تجاویز پیش کی ہیں۔ وہ اگرچہ قرآنی نظام سے ہنوز پیچھے ہیں، لیکن وہ بھی باایں ہمہ قرآن کی اس حقیقت کی شہادت کس طرح واضح طور پر پیش کر رہی ہیں کہ

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا (۱۳/۴۱)

کیا یہ لوگ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین (کے رقبوں) کو اس کے بڑے بڑے مالکوں کے ہاتھوں سے کس طرح کم کرتے چلے جا رہے ہیں؟

قرآنی فیصلے
روزمرہ زندگی کے ساٹھ اہم مسائل پر قرآنی روشنی میں بحث
۴۰۸ صفحات   قیمت چار روپے

حقائق و عبر

۱۔ صحیح آزادی

پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی، اہل علم طبقہ میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "تاریخ تہذیب" بڑی جامع کتاب ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ دل کی گہرائیوں میں بڑے پختہ قسم کے عیسائی ہیں (ایسے پختہ کہ بعض اوقات ان پر متشدد پادری ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے) لیکن بایں ہمہ ان کی نگاہیں بلند حقائق کو پا لیتی ہیں۔ حال ہی میں (امریکہ کے رسالہ COLLIER کی ۔ مارچ کی اشاعت میں) ان کا ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا، جس کا عنوان ہے: "انسان کو اس کی آزادی خدا کے ہاں سے مل سکتی ہے"۔ اس مضمون کی تمہید میں وہ کہتے ہیں کہ مغرب اس وقت جن تباہیوں میں مبتلا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانی ذات کا احترام اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے، اور اس کے تشکیل کردہ نظام میں انسانی آزادی سلب ہو گئی ہے۔ اس کے بعد پروفیسر مذکور بتاتے ہیں کہ انسان کو صحیح آزادی مل کیسے سکتی ہے؟ مضمون کے اس حصہ کا آزاد ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

"سوال یہ ہے کہ وہ کون سی شرائط ہیں جن کے مطابق انسانوں کو آزاد رکھا جا سکتا ہے؟ ان میں سب سے پہلی اور بنیادی شرط ایسی ہے، جو بظاہر متنازع دکھائی دیتی ہے۔ اسے ہم کچھ اس قسم کے الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں کہ

انسان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ اس حقیقت کو تسلیم نہ کرے کہ وہ اس کائنات کا صاحبِ اقتدار اور خود مختار حاکم مطلق نہیں۔

جب انسان اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگ جاتا ہے تو وہ انسانی آزادی کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اس لئے کہ جب انسان یہ خیال کرنے لگ جائے کہ وہ خدا ہے تو وہ اپنی پرستش کرنے لگ جاتا ہے، اور جب انسان اپنے آپ کی پرستش کرنے لگ جائے تو اس کا یہ انسانی معبود کوئی فرد نہیں ہوتا بلکہ انسانوں کی مجموعی قوت (سوسائٹی) ہوتی ہے۔ اور جب ہم انسانوں کی مجموعی قوت کی پرستش شروع کر دیں تو اس دیوتا کے تمام پرستار غلام بن کر رہ جاتے ہیں"۔

اس کے بعد پروفیسر مذکور لکھتے ہیں کہ صحیح عیسائیت "انسانی پرستش" کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہے اور اس نفرت میں اسلام بھی عیسائیت کا ساتھی ہے۔ اور اسلام اور عیسائیت دونوں نے یہ سبق یہودیت سے سیکھا ہے۔

ازاں بعد وہ لکھتے ہیں کہ

"وہ عقیدہ کونسا ہے جو اس طرح یہودیت، عیسائیت اور اسلام میں مشترک ہے؟ میں اسے صاف اور سادہ الفاظ میں یوں کہوں گا کہ وہ عقیدہ ہے

لا الٰہ الا اللہ

یعنی انسان خدا نہیں۔ نہ انسانوں میں سے کوئی ایک فرد خدا ہے۔ اور نہ ہی نوع انسانی کی مجموعی قوت ہی خدا ہے۔ انسان کو اس کی آزادی خدا کی بارگاہ سے ملتی ہے۔ وہ اس لئے آزاد ہے کہ خدا نے اسے آزاد پیدا کیا ہے۔ اور خدا نے انسان کو اس لئے آزاد پیدا کیا ہے کہ وہ انسان کو اس کا موقع بہم پہنچائے کہ وہ خدا کے لامتناہی تخلیقی پروگرام میں آزادانہ طور پر شریک ہو سکے۔ اور جب خدا نے انسان کو آزادی دی ہے تو اس سے یہ بھی ممکن ہے کہ جب اسے خدا اپنی رفاقت کے لئے بلائے تو وہ خدا کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دے۔ نوع انسانی کی تاریخ خدا اور بندے کے درمیان اسی کشمکش کی داستان ہے۔ جس میں خدا، ہر انسان کو چیلنج دیتا ہے کہ وہ اس بات کا آزادانہ فیصلہ کرے کہ وہ اپنے آپ کو خدا کی مشیت سے ہم آہنگ رکھنا چاہتا ہے یا نہیں۔ جب انسان اس سے انکار کرتا ہے تو وہ اپنے اختیار وارادہ سے ایسا کرتا ہے۔ لیکن پھر اسے اس روش کے نتائج بھی بھگتنے پڑتے ہیں۔ جب انسان خدا کی دعوت پر لبیک کہتا ہے تو اسے اس کا صلہ یہ ملتا ہے کہ خدا اسے اپنے تخلیقی پروگرام میں اپنا رفیق بنا لیتا ہے۔ جب انسان اس طرح خدا کا رفیق بن جاتا ہے تو اس وقت اس کی آزادی اپنی انتہائی بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے۔ اس لئے کہ اس وقت انسانوں کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ خدا نے کتنی عظیم صلاحیتیں ان کے اندر مضمر رکھی ہیں۔ خدا نے انسان کو پیدا ہی اس لئے کیا ہے کہ وہ اس کے تخلیقی پروگرام میں آزادانہ شریک ہو سکے۔

یہ وجہ ہے کہ انسانی ذات (یعنی ہر فرد انسانیہ کی ذات) کی آزادی خدا کے نزدیک اس قدر قیمتی ہے۔ اور چونکہ یہ خدا کے نزدیک قیمتی ہے۔ اس لئے اسے دیگر افراد انسانیہ کے نزدیک بھی قیمتی ہونا چاہیئے۔ لہذا

(۱) ہر فرد انسانیہ کا آزادانہ، خدا کے تخلیقی کارناموں میں اس کا رفیق بن جانا اور

(۲) خدا کی نگاہوں میں اس کی آزادی کا متاعِ گراں بہا ہونا۔

یہی وہ تصورات ہیں۔ جس کی بنا پر انسانی معاشرہ میں ہر فرد واجب التکریم قرار پاتا ہے۔

اگر انسانی فرد، خدا کا منتخب کردہ آزاد، رفیق کار نہ ہوتا۔ اگر وہ نوع انسانی کی اجتماعی مشینری میں محض ایک پرزے کی حیثیت رکھتا[1]۔ تو اسے آزادی کا کوئی حق حاصل نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ایک پرزے کے آزاد اور صاحب اختیار وارادہ ہونے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں ہو سکتی۔ اس کا تصور ہی احمقانہ ہے۔ ذرا سوچئے! اگر شہد کی مکھی یہ کہنے لگ جائے کہ میرا جو حصہ چھتہ کیلئے ہے... [handwritten margin note]

---

[1] ٹوئن بی نے (ANT) اور (ANT HEAP) کی مثال دی ہے۔ یعنی معاشرہ کا ایسا نظام جس میں ہر فرد معاشرہ کی خاطر یعنی معاشرہ کی خاطر کام کرتا۔ اور معاشرہ کے لئے مرتا ہے۔ اس کی ذاتی حیثیت کچھ نہیں ہوتی۔

تو اس کا یہ دعوےٰ کس قدر مضحکہ انگیز اور خود پسندانہ ہوگا؟ اسی طرح اگر ایک فرد یہ کہے کہ میں معاشرہ کی خاطر نہیں بلکہ معاشرہ میری خاطر ہے تو اس کا یہ دعوےٰ بھی خود پسندی پر مبنی سمجھا جائے گا۔ تا آنکہ ہم اس بنیادی حقیقت کو تسلیم نہ کرلیں کہ

(۱) ہر فرد انسانیہ کی آزادی خدا کی نظروں میں قیمتی ہے۔ اور

(۲) وہ خدا جس نے ہمیں یہ آزادی بہ حیثیت پیدائشی حق کے دی ہے۔ معاشرہ کی مجموعی قوت کا نام نہیں۔

عیسائیت، اسلام اور یہودیت کا خدا، انسانی فطرت، انسانی معاشرہ، بلکہ تمام کائنات سے ماوراء ہے۔ وہ کائنات کے اندر محض اس حیثیت سے ہے کہ وہ کائنات کا خالق ہے۔ لیکن وہ خود کائنات نہیں۔ اور جب کائنات خدا نہیں ہوسکتی تو انسان کس طرح خدا ہوسکتا ہے؟ وہ کائنات یا انسان کا مظہر بھی نہیں۔ وہ ایک زندہ اور پائندہ خدا ہے۔ وہ حقیقت مطلقہ ہے:

اس کے بعد پروفیسر ٹوئن بی نے بتایا ہے کہ بعد کی عیسائیت نے کس طرح ان بنیادی عقائد کو نظر انداز کردیا۔ اور کس طرح خدا کا رفیق اور آزاد انسان' تہذیب حاضر میں محض مشین کا پرزہ بن کر رہ گیا ہے۔ آخر میں انھوں نے کہا ہے کہ اگر ہم اپنی بازآفرینی چاہتے ہیں تو اس کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم پھر انہی عقائد کو اپنی تہذیب کی خشت بنیاد قرار دیدیں۔

قطع نظر اس کے کہ یہودیت اور عیسائیت کس حد تک لا الٰہ الا اللّٰہ (توحید) اور ولقد کرمنا بنی آدم (احترام آدمیت) کی پیغامبر ہے۔ قابل غور یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے جن اقدار کو انسانی تہذیب و معاشرت کی بنیادیں قرار دیا ہے۔ اس فاضل مغرب کی نگاہوں نے انھیں کس قدر صاف اور واضح انداز میں دیکھ لیا ہے۔ یہ صرف اس قرآنی تعلیم کا اثر ہے جو غیر شعوری طور پر فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ورنہ یہودیت اور عیسائیت، خدا اور انسان کے متعلق اس قسم کا تصور پیش ہی نہیں کرسکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی انسان اپنے ادراک کو ذاتی رجحانات و عواطف سے بے رنگ کرکے، علم کی بارگاہ سے فتویٰ طلب کرے گا۔ تو اسے قرآنی حقائق کے علاوہ اور کوئی جواب نہیں ملے گا۔

---

۲. پابندیاں اور آزادیاں

جب سے عائلی کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس قسم کی باتیں سننے میں آرہی ہیں۔ جن پر تعجب بھی ہوتا ہے اور تاسف بھی۔ تعجب اس لئے کہ یہ حضرات کس طرح انسانوں کی خود ساختہ شریعت کو خدا کا دین بتا کر لوگوں کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور تاسف اس لئے کہ جو غیر مسلم ان حضرات کے بتائے ہوئے مسلک و منہاج کو اسلام سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام کے متعلق کیا رائے قائم کرتے ہوں گے! اس ضمن میں ایک دو نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ عبدالماجد صاحب دریا بادی' اپنے اخبار صدق کی ۲۷ر جولائی کی اشاعت میں 'سچی باتوں' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:۔

" شریعت نے وضو کا قائم مقام حسب ضرورت تیمم کو قرار دیا ہے۔ اب اگر کوئی صاحب یہ شرط لگا دیں

کو تیمم کی اجازت مریض کو جب ہی مل سکتی ہے۔ جب پہلے ڈاکٹروں کی ایک جماعت مریض کو ضرورت کا سرٹیفکیٹ دیدے۔ تو یہ شریعت پر اضافہ ہوا یا نہیں ؟ شریعت نے مریض کو اجازت دی ہے کہ بجائے کھڑے ہونے کے بیٹھ کر بھی نماز پڑھ سکتا ہے۔ اب اگر کوئی صاحب یہ قید لگا دیں کہ بیٹھنے کی اجازت سے نمازی اسی وقت مستفید ہو سکتا ہے۔ جب پہلے کوئی بھی بورڈ اس ضرورت پر مہر استناد لگا دے۔ تو یہ شریعت کی آزادی کو تنگی سے بدل دینا ہوا یا نہیں ؟ —— عبادات کو چھوڑیئے۔ کوئی روشن خیال صاحب یہ تحریک اگر شروع کر دیں کہ عقدِ نکاح فلاں سن سے قبل اور فلاں سن کے بعد ناجائز ہے۔ اس لئے کہ مقاصدِ نکاح ان سنوں میں پورے نہیں ہو سکتے۔ تو یہ روشن خیالی ہوئی یا تنگ نظری ؟ نرم جبر خلق کوئی صاحب اگر یہ حکم لگا دیں کہ فلاں رقم سے زائد باندھنا حرام ہے تو یہ ترمیم مداخلت فی الدین کی حد تک پہونچ جاتی ہے یا نہیں ؟۔ غرض عبادات ہوں یا معاملات شریعت نے جن مسائل میں فرد کے ضمیر کو آزادی بخشی ہے' ان کو از سر نو انسان کے بنائے ہوئے ضابطوں' قیدوں کے تحت میں لانا شریعت کی بخشی ہوئی آزادیوں سے بندوں کو محروم کر دینا ہے۔

بیوی ایک ہو یا ایک سے زائد بیویاں ایک شوہر کی ہوں۔ شوہر اگر ان کی حق تلفی کر رہا ہے تو اس کا یہ علاج بالکل اناڑیوں کا سا علاج ہے کہ اس سے اس کا حق زوجیت ہی چھین لیا جائے۔ یا اس کے اس حق کو جکڑ بند میں لے لیا جائے۔ صحیح علاج صرف یہ ہے کہ اس کے ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ اس کے دل میں خوف خدا پیدا کیا جائے اور اس کے مضمحل حاسہ اخلاقی وذہنی میں از سر نو توانائی لائی جائے۔ کوئی نمازی یا روزہ دار خدا کو دھوکہ دے کر شریعت کی بخشی ہوئی رعایتوں اور سہولتوں سے اگر ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ تو اپنے عمل کے نتائج خود بھگتے گا۔ معاشرہ یا حکومت کو اس پر جبر کا کوئی حق نہیں اور ایسے معاملات میں نئی نئی قیود کا اضافہ پیش کرنا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ (نعوذ باللہ) اللہ میاں سے سہو کوتاہی رہ گئی تھی تو اس کی تلافی ان طریقوں سے ہو جائے گی ؟ —— نادان کی دوستی ! اللہ اس کے شر وفتنہ سے پناہ دیں رکھے !

اور ۳؍ اگست کے صدق میں اس پر اضافہ فرماتے ہیں کہ

نکاح ایک عورت کے ساتھ ہو یا ایک سے زائد کے ساتھ۔ جتنا زیادہ آپ اس کی سادگی کو ختم کریں گے اور عدل وغیرہ کی آڑ پکڑ کر جتنی قانونی قیدیں اس پر لگاتے جائیں گے۔ جتنا زیادہ اسے ایک عدالتی چیز بناتے جائیں گے۔ اسی قدر اس کی راہ میں دشواریاں اور اس کی مقابل چیز، زنا یا سفاح کی راہ میں آسانیاں پیدا کرتے چلے جائیں گے۔ جس پر یورپ اور امریکہ اور سارے ان ملکوں کی حالت گواہ ہے۔ جہاں نکاح کو فطرت بشری کے مطالبوں اور تقاضوں کے برخلاف ایک پر تکلف اور پیچیدہ مسئلہ بنا دیا گیا

شوہر اگر بیوی یا بیویوں کے حقوق ادا نہیں کرتے تو اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ان میں احساسِ فرائض کا جذبہ بیدار کیا جائے۔ ان کو ایک مسلم شوہر کے فرائض یاد دلائے جائیں۔ نہ یہ کہ ان سے وہ حقوق ہی طلب کر لئے جائیں یا محدود کر دیئے جائیں جو ان کی شریعت نے انہیں دے رکھے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ یہ حضرات دین کے حقائق اور شریعت کے احکام کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ لیکن ان کا انداز کس قدر عامیانہ اور دلائل کس قدر سطحی ہوتے ہیں۔ دین کے متعلق گفتگو کا انداز یہ ہونا چاہیئے کہ فلاں شخص یہ کہتا ہے لیکن اس کے برعکس اللہ تعالےٰ کا اس باب میں یہ ارشاد ہے۔ اس سے بات صاف ہو جائے گی۔ آپ فرماتے ہیں کہ جن امور میں شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی ان میں پابندیاں لگانے کا کسی کو حق نہیں۔ بالکل بجا اور درست۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی تو کہیئے کہ جن امور پر شریعت نے پابندیاں لگائی ہیں۔ ان پابندیوں کو اٹھانا بھی کسی کے لئے جائز نہیں۔ سوال یہ ہے کہ مسئلہ زیرِ نظر میں کس کی روش اس اصول کے مطابق ہے اور کس کی روش اس اصول کے خلاف؟ نکاح کی عمر کیلئے قرآن نے بلوغت کی شرط عاید کی ہے۔ تعدد ازدواج کے لئے اس نے صاف صاف کہا ہے کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن میں یتامیٰ (بے شوہر عورتوں اور لڑکیوں اور یتیم بچوں) کا مسئلہ صحیح طور پر حل نہ ہو سکے تو اس کی ایک صورت یہ ہے کہ تم ان عورتوں سے شادی کرو۔ تعدد ازدواج کی اجازت صرف انہی حالات میں دی گئی ہے۔ طلاق کے لئے اس نے ثالث مقرر کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس کے برعکس ہمارا قدامت پرست طبقہ کہتا ہے کہ نکاح کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں۔ ایک سال کے لڑکے اور چھ ماہ کی لڑکی کی بھی شادی ہو سکتی ہے۔ تعدد ازدواج کے لئے یتامیٰ کے مسئلہ کی کوئی شرط نہیں۔ جس کا جی چاہے اور جب جی چاہے وہ تین چار بیویاں کر سکتا ہے۔ طلاق کے معاملہ میں کسی کو دخل دینے کا حق نہیں۔ مرد جب چاہے طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر بیوی کو الگ کر دے۔

"روشن خیال" طبقہ کہتا ہے کہ ان امور پر جو پابندیاں اللہ تعالےٰ نے عاید کر رکھی ہیں کسی کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ ان پابندیوں کو اٹھائے۔ ان کی تجویز یہ ہے کہ ان امور پر وہ پابندیاں ضرور عاید کی جائیں جو خدا نے عاید کی ہیں۔ اس کے خلاف قدامت پرست طبقہ کا کہنا یہ ہے کہ جن امور کو ہم نے کھلا رکھ چھوڑا ہے ان پر کسی کو پابندیاں لگانے کا حق نہیں رہتی کہ ان کے دعوے کے مطابق خدا کو بھی اس کا حق حاصل نہیں)

اب آپ سوچئے کہ اس باب میں کس فریق کا مسلک صحیح ہے! اللہ کی شان ہے کبھی مولوی صاحبان کو شکایت تھی کہ یہ "فرنگ زدہ" طبقہ شریعت کی پابندیوں کو توڑنا چاہتا ہے۔ اور اب انہیں شکایت ہے کہ ان پابندیوں کو عاید کیوں کرتا ہے؟

آخر میں ہم پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ اس باب میں گفتگو کا صحیح طریق یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ جن پابندیوں کو یہ روشن خیال طبقہ عاید کرنا چاہتا ہے۔ وہ کس طرح ان کی خود ساختہ ہیں۔ خدا کی عاید کردہ نہیں ہیں۔ اور جو آزادیاں قدامت پرست طبقہ دیتا ہے۔ وہ آزادیاں ان کی اپنی وضع کردہ نہیں۔ خدا کی عطا فرمودہ ہیں۔ بحث کو ان حدود میں رکھیئے تو بات صاف ہو جائے گی لیکن چونکہ قدامت پرست طبقہ جانتا ہے کہ اس طرح فیصلہ ان کے خلاف ہوگا۔ اس لئے وہ دلائل و حقائق کے بجائے طنز و استہزا،

پر اتر رہا ہے۔

۳۔ دلچسپ

۳ر اگست کے صدق میں (جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے) ایک دلچسپ خبر شائع ہوئی ہے۔ وہو ھذا۔

"دمشق سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے تیسرے مکتوب بنام مدیر الفرقان (لکھنؤ) میں اجلاس موتمر اسلامی دمشق کی داد و تحسین کے بعد:۔

" دو چیزیں میرے لئے اس موتمر میں کوفت اور انقباض کا باعث ہوئیں۔۔۔۔۔ ایک تو یہ کہ موتمر پر اول سے آخر تک سیاسی و مجلسی ذہن و فضا غالب تھی۔ وہی دستوری موشگافیاں۔ وہی خطابت کے مظاہرے وہی پر جوش تقریریں۔ مندوبین میں سے بعض کا بلے ضرورت بولنے پر اصرار۔۔۔۔

دوسری چیز جو میرے انقباض کا باعث ہوئی وہ یہ کہ مودودی صاحب جب پہلے عمومی اجتماع میں اسٹیج پر آئے تاکہ کانفرنس کے متعلق اور مسئلہ فلسطین کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں تو انھوں نے منتظمین جلسہ سے خواہش کی کہ ان کی اردو تقریر کا ترجمہ میں کروں۔ میں بعض وجوہ سے اس کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن انھوں نے کئی بار اس کا تقاضا کیا۔ اور منتظمین جلسہ نے جو ہم لوگوں کے ذہنی اختلاف سے بخوبی واقف نہیں اصرار کے ساتھ مجھ سے اس کی خواہش کی کہ میں ترجمہ کر دوں۔ مجبوراً طبیعت کے انقباض کے ساتھ یہ خدمت انجام دینی پڑی۔ اگرچہ تقریر کا تعلق صرف مسئلہ فلسطین سے تھا۔ اور اس میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو میرے لئے موجب انقباض ہوتی۔ لیکن صرف اس بنا پر کہ کہیں لوگ اس ترجمانی کو نظریات کے اتحاد پر محمول نہ کریں مجھے اس میں تردد تھا۔ اس لئے میں مناسب یہی سمجھتا تھا کہ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے۔" (الفرقان بابت جولائی ۵۶ء صفحہ ۵۲)

روایت اتنی حیرت انگیز ہے کہ ندوی کی شخصیت اگر اس درجہ ثقہ و مستند نہ ہوتی تو اس پر یقین کرنا ہی مشکل تھا۔

آہ بچارا ندوی!

۴۔ برہمو سماجی اسلام

ماہنامہ ثقافت کی اگست کی اشاعت میں، خلیفہ عبدالحکیم صاحب (مدیر ثقافت) نے اس کانفرنس کے کچھ کوائف لکھے ہیں، جو قریب دو سال اُدھر امریکہ کی "فرینڈز آف دی مڈل ایسٹ سوسائٹی" کے زیر اہتمام لبنان میں منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں قریب چالیس عیسائی (تمام عیسوی دنیا سے) اور اسی قدر مسلمان (اسلامی دنیا سے) مدعو تھے۔ پاکستان سے خلیفہ صاحب شریک محفل تھے۔ اس کانفرنس میں خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ

اسلام اور اہلِ کتاب کے مذاہب (یہودیت، عیسائیت وغیرہ) میں بہت کچھ قدرِ مشترک ہے۔ سب خدا کے قائل ہیں۔ دعا کو مؤثر جانتے ہیں۔ اخلاقی اقدار بہت کچھ مشترک ہیں۔ جسمانی موت کو انجامِ حیات نہیں سمجھتے۔ آخرت اور جزا و سزا کے قائل ہیں۔ خدا کو رب اور رحیم و کریم مانتے ہیں۔ انسانوں کے ساتھ عدل و رحم کے سلوک کو جوہرِ دین سمجھتے ہیں۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:-

اس کانفرنس میں جو مضامین پڑھے گئے۔ ان کو سن کر میرے اس خیال میں تقویت پیدا ہوئی کہ خدا کے قائل تمام معقول انسانوں کے نزدیک اقدارِ حیات بہت کچھ مساوی اور ہم آہنگ ہیں۔ لیکن ہر گروہ ان کو اپنے مذہب اور اپنی مذہبی روایات سے اخذ کرتا ہے اکثر اوقات اصطلاحیں مختلف ہوتی ہیں لیکن معانی میں اختلاف نہیں ہوتا۔ کم نظر لوگ اختلافِ اصطلاح کو اختلافِ عقیدہ سمجھ کر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتے ہیں لیکن جو شخص مختلف اصطلاحوں کو معنوی نظر سے دیکھے وہ الفاظ کی پیکار کو بیکار سمجھتا ہے۔

ہم خلیفہ صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ اگر ان کی تصریحات کے مطابق (اخلاقی اقدار اور دین کے اصول یا ابوالکلام صاحب آزاد کے الفاظ میں عالمگیر سچائیاں) تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اور اختلاف صرف لفظی اصطلاحات کا ہے۔ معنوی اختلاف کوئی نہیں۔ تو پھر اللہ میاں نے اہلِ کتاب کے متعلق یہ کیوں کہہ دیا کہ

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ (۲/۱۳۷)

سو اگر یہ اہلِ کتاب (اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم (مسلمان) ایمان لائے ہو تو اس صورت میں یہ لوگ راہِ ہدایت پر ہوں گے اور اگر یہ اس راہ سے ہٹ کر کوئی دوسری راہ اختیار کریں گے تو یہ یقیناً (حق کی) مخالفت پر ہوں گے۔

اور ماننزل علیٰ محمد (۴۷/۲) پر ایمان کو اس ایمان کی شرطِ لازم کیوں قرار دے دیا؟ خلیفہ صاحب کو چاہیئے کہ اپنے جیسے اور حضرات کے تعاون سے جو اس قسم کی کانفرنسوں میں اسلام کے نمائندہ کی حیثیت سے اکثر شامل ہوتے رہتے ہیں) قرآن سے اس قسم کی تمام آیات کو نکال دیں جن میں کہا گیا ہے کہ اب تمام نوعِ انسانی کے لئے نجات و سعادت کی ایک ہی راہ ہے اور وہ راہ اس دین کی راہ ہے جسے محمد رسول اللہ نے نوعِ انسانی تک پہنچایا۔ اس قسم کی آیات (جو ان حضرات کے خیال میں سخت تنگ نظری پر مبنی ہیں) ان کی کشادہ ظرفی اور وسعتِ قلبی کی راہ میں خواہ مخواہ حائل ہوتی رہتی ہیں۔ آزاد صاحب نے گاندھی جی سے کہدیا تھا کہ اسلام اور ہندو دھرم اصولی سچائیوں کے لحاظ سے ایک ہی ہیں آپ انگلینڈ اور امریکہ سے کہتے رہیئے کہ عیسائیت اور اسلام اصل کے اعتبار سے ایک ہیں۔ اور اس کے بعد خوش ہو جایئے کہ

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

اسلام بھی کس قدر مظلوم ہے کہ جس کا جو جی چاہے اس کے متعلق کہدے۔ کوئی پوچھنے والا ہی نہیں!

۵۔ یہ اختلافات

ہفتہ وار صدق (لکھنؤ) کی ۱۰ اگست کی اشاعت میں حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے:

• وہابی اگر مسجد میں اذان کہدے تو اس اذان پر حنفیوں کی نماز ہوسکتی ہے یا نہیں؟ نیز وہابی اگر منبر پر اذان کہنے کی غرض سے چڑھا تو اس کو یہ کہہ کر نیچے اتار دینا کیا حکم رکھتا ہے کہ ہم وہابی کی اذان نہیں سننا چاہتے؟

• وہابی اگر مسجد میں آجائے یا لوٹے کو ہاتھ لگادے تو کیا مسجد اور لوٹا ناپاک ہوجاتے ہیں اور لوٹا دھونے اور گھوٹنے کے قابل ہوجاتے ہیں؟

یہ نمونہ ہوا بعض سوالات کا۔ اب بعض جوابات کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

(اہل سنت کی) نماز اہل ہوا و اہل بدعت جن کی بدعت حد کفر تک پہنچی ہے ان کے پیچھے نماز اصلاً جائز نہیں بلکہ باطل ہے۔ جیسے غیر مقلدین نماز اور وہابیہ، دیوبندیہ، روافض اور قادیانی اور چکڑالوی وغیرہ۔ اور ان کی نماز مقلدین کے پیچھے ہوتی ہے یا نہیں، یہ وہ جانیں۔ ہمارے نزدیک جب وہ مسلمان نہیں۔ ان کی نماز کا کیا اعتبار۔ فتح المبین۔ شواہد الحق وغیرہ۔

غیر مقلد، وہابی، دیوبندی، روافض، قادیانی، چکڑالوی وغیرہ کے ساتھ میل جول سلام کلام اور ان کے ساتھ کھانا پینا سب حرام اور ناجائز ہے۔ بدعقیدہ کے ساتھ نہ کھاؤ پیو۔ نہ نکاح کرو۔ نہ محبت رکھو۔ نہ ان کے ساتھ نماز پڑھو۔ بیمار ہوجائیں تو مزاج پرسی نہ کرو اور مرجائیں تو جنازہ نہ پڑھو۔

سوالات، جن کا صرف نمونہ یہاں درج ہوا، سو پچاس برس پہلے کے نہیں۔ اسی ۱۹۵۵ء کے ہیں اور جوابات کا نمونہ بھی ایک حضرت امام المفسرین شیخ الحدیث والتفسیر مولانا الحاج علامہ ابو . . . . . صاحب ناظم حزب الاحناف کے قلم سے (پاکستان کے مشہور شہر لاہور میں) اسی ۱۹۵۵ء میں ادارہ مذکور کے رسالہ میں شائع ہوئے ہیں۔

جو کچھ ان سوالات اور جوابات میں کہا گیا ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ ہمارے ہاں مذہبی فرقوں کے یہ اختلافات صدیوں سے مسلسل چلے آرہے ہیں اور (اب تو پھر بھی ان کی شدت کم ہوگئی ہے۔ ورنہ) ان کی وجہ سے جس قدر خونریزیاں اور فساد انگیزیاں ہوئی ہیں، تاریخ کے اوراق ان پر شاہد ہیں۔ مدیر صدق نے اس پر تبصرہ یہ کیا ہے کہ

حقیقتاً یہ کہنا مشکل ہے کہ اس اپنے چودہ سو سال کی مدت میں امت کو کس سے نقصان پہنچا ہے۔ اسلام کے کھلے ہوئے دشمنوں، منکروں اور معاندوں نے یا اس کے لیے ایسے ایسے نادان دوستوں نے! یقطعون ما امر اللہ بہ ان یوصل کا ایک نیا مصداق!۔

لیکن اصل سوال یہ ہے کہ اس تمام فرقہ بندی اور گروہ سازی، اور پھر ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے فتنہ و فساد کا اصلی باعث کیا ہے؟ جب تک آپ اس اصل تک نہیں پہنچیں گے۔ ان مفسدات کا علاج ناممکن ہوگا۔

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ یہ قرآن کا ایک ایسا فیصلہ ہے جس سے کسی فرقہ کو بھی اختلاف نہیں۔ یہ بھی واضح ہے کہ قرآن وحدت (توحید) کی تعلیم دیتا ہے، تفرقہ (اور شرک) کی تعلیم نہیں دیتا۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ جو امت قرآن پر عمل پیرا ہے اس میں فرقے پیدا ہو جائیں۔ اگر ہم ایسا تسلیم کر لیں تو (معاذ اللہ) قرآن کے متعلق یہ ماننا پڑے گا کہ ایک طرف وہ فرقہ پرستی کو شرک قرار دیتا ہے اور دوسری طرف اس کی اپنی حالت یہ ہے کہ جو قوم اس پر عمل پیرا ہوتی ہے وہ فرقوں میں بٹ جاتی ہے۔ اس سے ایک ہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ہمارے فرقے، قرآن سے الگ ہو جانے کا نتیجہ ہیں۔ رسول اللہ کے زمانے میں جب تک امت قرآن پر عمل پیرا رہی، اس میں کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا۔

(۳) ان فرقوں میں جس قدر اختلافات ہیں (وہ عقائد کے ہوں یا اعمال کے) ان کی بنیاد کسی نہ کسی روایت پر، یا فقہ کے فیصلے پر ہوتی ہے۔ جہاں یہ لوگ قرآن کو پیش کرتے ہیں، وہاں یہ قرآن کا مفہوم بھی کسی نہ کسی روایت کے تابع متعین کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب تک آپ فقہ اور روایات کو غیر متبدل دین کا درجہ دیتے رہیں گے، ان فرقوں کا وجود باقی رہے گا۔ اور جب تک فرقے موجود رہیں گے ان کی سرپھٹول بھی باقی رہے گی۔

(۴) فرقہ بندی کو خود روایات تقویت پہنچاتی ہیں۔ چنانچہ یہ حدیث عام طور پر پیش کی جاتی ہے کہ اختلاف امتی رحمۃ۔ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ حالانکہ قرآن کریم اختلاف کو رحمت نہیں، خدا کا عذاب قرار دیتا ہے۔ نیز یہ بھی حدیث ہے کہ میری امت میں بہتر فرقے ہوں گے۔ اور ان میں سے ایک ناجی ہوگا۔ باقی گمراہ۔ "ایک ناجی ہونے" کی استثناء، ہر فرقے کو سند عطا کر دیتی ہے کہ وہی ناجی ہے باقی سب گمراہ ہیں۔ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے، وہیں اس حقیقت کا بھی اظہار کر دیا ہے کہ اس سے ہوتا یہ ہے کہ کل حزب بما لدیھم فرحون۔ ہر فرقہ اپنے اپنے عقیدہ میں مگن رہتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان دلا لیتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔ اس میں کسی کی استثناء نہیں۔

(۵) مملکت پاکستان میں، اسلامی دستور کے تدوین کے وقت ملک کے ۳۱ علمائے کرام نے متفقہ طور پر یہ مطالبہ پیش کیا کہ "اسلامی فرقوں" کے وجود کو آئینی طور پر تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ دستور پاکستان میں ان فرقوں کے تحفظ کے لئے واضح شق موجود ہے۔

ان تصریحات کے بعد آپ سوچئے کہ ان حضرات کا (جو فرقہ بندی کے نتائج و عواقب پر اس طرح سرزنش کرتے ہیں) طرز عمل کیا ہے؟ یہ حضرات فرقہ بندی کے پودوں کی پوری پوری حفاظت کرتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح پانی دیتے رہتے ہیں۔ ان کے اردگرد باڑ لگاتے ہیں۔ لیکن جب ان کے کانٹے ان کے دامنگیر ہوتے ہیں تو پھر چیخنا چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ چیختے بھی جاتے ہیں اور ان پودوں کو پانی بھی دیتے جاتے ہیں۔

یاد رکھئے! جب تک امت دوبارہ قرآن کی طرف نہیں آتی۔ فرقہ بندی کی لعنت کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

دوسرا ایڈیشن

اسباب زوال امت

ضخامت ۱۷۲ صفحات

قیمت دو روپیے

اسکیم پیشگی خریداران ادارۂ طلوعِ اسلام

مئی ۱۹۵۳ء میں نافذ کی گئی تھی۔ اسکیم میں قارئین طلوعِ اسلام سے اپیل کی گئی تھی کہ چونکہ طلوعِ اسلام کی آواز بہت محدود ہے اور زمانے کا تقاضہ ہے کہ اسے دور تک پھیلایا جائے۔ اس لئے آپ کے تعاون کی ضرورت ہے۔ اس تعاون کی شکل یہ ہے کہ آپ

پیشگی خریداران کے حلقے میں

شامل ہو جائیں۔ یعنی آپ ایک سو روپیہ (یکمشت یا چار ماہانہ اقساط میں) ادا فرمادیں۔ اس کے معاوضہ میں رسالہ طلوعِ اسلام اور اس ادارہ کی مطبوعات اس وقت تک آپ کو ملتی رہیں گی۔ جب تک آپ کی یہ رقم پوری نہ ہو جائے۔ قارئین طلوعِ اسلام میں سے کچھ حضرات نے ہماری آواز پر لبیک کہا اور ان کی معاونت سے قرآنی نظام ربوبیت سے متعلق بہت سا لٹریچر اب تک شائع اور ملک کے اطراف و جوانب میں پھیلایا جا چکا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا ہے ابھی ادارہ کی طرف سے بہت سی اہم کتابیں اور شائع ہونگی۔ یہ کہتے ہوئے

ہمیں بڑی مسرت ہوتی ہے

کہ ہماری یہ اسکیم اس حیثیت سے کامیاب رہی کہ بیشتر پیشگی خریداران کی وصول شدہ رقم ختم ہو چکی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۵ء کے حسابات گوشوارے تمام خریداران کی خدمت میں بھیجے جا چکے ہیں اور ۱۹۵۶ء کا خرچ شامل کرنے کے بعد بعض خریداران کے کھاتہ میں رقم ختم ہو گئی ہے اور بعض کے کھاتے میں رقم موصولہ سے زیادہ خرچ ہو چکا ہے۔ ان تمام حضرات سے تجدید رقم کی درخواست کی جا چکی ہے کہ انہیں مزید

ایک سو روپے جلد از جلد بھیج دینے چاہئیں

تاکہ قرآنی لٹریچر کی اشاعت کا یہ سلسلہ جاری رکھا جا سکے۔ اور ادارہ نے جو قدم اٹھایا ہے۔ وہ مسلسل آگے بڑھتا رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ کہتے ہوئے ہمیں افسوس ہے کہ ہماری یہ اسکیم اب تک اتنی عام نہیں ہو سکی جس قدر ہماری خواہش تھی۔ اس لئے اس سلسلہ میں مزید کوشش کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات اس اسکیم میں شریک ہو سکیں۔ یاد رکھئے! اس اسکیم میں شامل ہونے سے آپ ادارۂ طلوعِ اسلام کو اپنی گرہ سے کچھ نہیں دیتے آپ جس قدر رقم دیتے ہیں۔ اس قیمت کی کتابیں آپ کو گھر بیٹھے مل جاتی ہیں۔ اور ان پر محصول ڈاک بھی ادارہ خود ادا کرتا ہے۔ آپ سے وصول نہیں کرتا۔ ادارہ کی مدد صرف اتنی ہوتی ہے کہ اسے یہ رقم پیشگی مل جاتی ہے کیا آپ ادارہ کی اتنی سی مدد بھی نہیں کریں گے؟

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام ۱۵۹/۳ - اے ایل (پی۔ ای۔ سی۔ ایچ) ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبر ۲۹

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

جشن نامے
ایسے عنوانات جنہیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی سچی ہرتی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاج شناسِ رسول
یہ کون بتائے کہ صحیح احادیث کون سی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول ——۔ مزاج شناس رسول کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملیگی۔ قیمت چار روپے

مقام حدیث
حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جوابات۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملیں گی
دو جلدیں۔ ہر جلد کے قریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے۔

قرآنی دستورِ پاکستان از۔ پرویز
اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے اور حکومت۔ علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے ۲۲۴ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام
اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اس کے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری رح کے مقالات کا مجموعہ جنہوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں ۱۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

نوادرات از۔ علامہ اسلم جیراجپوری رح
علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ
بڑا سائز ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

اسلامی معاشرت از۔ پرویز
مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ۔ بننے سنورنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں ۱۹۲ صفحات قیمت دو روپے

قرآنی فیصلے
روزمرہ کی زندگی کے ساٹھ اہم مسائل و معاملات پر قرآنی روشنی میں بحث
۴۰۸ صفحات قیمت چار روپے

اقبال اور قرآن از۔ پرویز
علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

اعجاز القرآن از۔ علامہ تمنا عمادی مدظلہ
جس میں مختلف جہات سے قرآن
سائز ۲۰×۳۰/۸ ضخامت ۱۱۲ صفحات قیمت غیر مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل ۔ پی۔ ای سی ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی نمبر ۲۹

خوشگوار
صحت
کیلئے
مسواک ٹوتھ پیسٹ
استعمال کیجئے
MISWAK
MISWAK
MAKES
TEETH
PEARLY
WHITE

کیڑے نہ کھائیے

وہ چھالیہ جس کو پیڑ کی شاخوں پر کیڑوں نے اپنا مسکن بنالیا تھا آپ خوشبوؤں کے بہانے پان میں [illegible] استعمال کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہی کیڑے آپ کے گلے کو خراب کر رہے ہوں۔ اور آپ کو اس کا گمان بھی نہ ہوتا ہو۔

پان کھانا ہے

تو

پان کے اجزا پر نگاہ رکھیے

ہنسا چھالیہ

* صاف ہے
* خشک ہے
* پرانی ہے

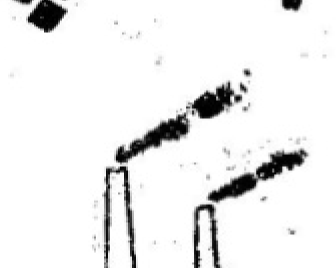

— پیکٹ میں ہر جگہ ملے گی —

تیار کردہ: محمد اصغر محمد یونس چھالیہ والے جونا مارکیٹ، کراچی ۲